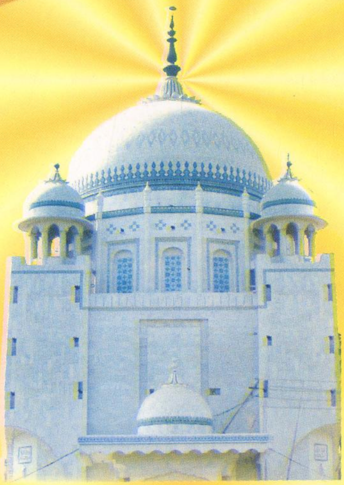
کتاب الوسیلہ



ازقلم

حضرت علامہ

سید ارشد سعید کاظمی

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم ملتان

ناشر

کاظمی پبلی کیشنز

جامعہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم ملتان

کتاب الوسیلہ

از قلم

حضرت علامہ

سید ارشد سعید کاظمی

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ انوار العلوم، ملتان

☆..................ناشر..................☆

کاظمی پبلی کیشنز، جامعہ انوار العلوم، ملتان

نام کتاب	:	**کتاب الوسیلہ**
مصنّف	:	حضرت علامہ صاحبزادہ سید **ارشد سعید کاظمی**
بار	:	چہارم
ہدیہ	:	لوکل کاغذ-/50 روپے، امپورٹڈ کاغذ-/70 روپے
صفحات کتاب	:	**72**
سنِ اشاعت	:	**2011ء**

ملنے کا پتہ

مکتبہ مہریہ کاظمیہ متصل جامعہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم، ملتان
ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور۔ کراچی
فرید بک سٹال، ۳۸ اردو بازار، لاہور
اسلامک بک کارپوریشن، فضل داد پلازہ، اقبال روڈ، نزد کمیٹی چوک، راولپنڈی
کتب خانہ حاجی نیاز احمد، بوہڑ گیٹ، ملتان
احمد بک کارپوریشن، اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک، راولپنڈی
مکتبہ حسینیہ، نزد سبز منڈی، بہاولپور
المدینہ کتب خانہ بالمقابل اے سی آفس علی پور مظفر گڑھ
مکتبہ فیضان سنت، نزد پیپل والی مسجد اندرون بوہڑ گیٹ ملتان
کتب خانہ حاجی مشتاق احمد، اندرون بوہڑ گیٹ ملتان
المدنی کیسٹ ہاؤس شاہی عیدگاہ خانیوال روڈ ملتان

نوٹ۔ مفت تقسیم کرنے والے کو خصوصی رعایت دی جائے گی۔

عرضِ ناشر

زیرِ نظر مقالہ جگر گوشۂ غزالی زماں امام اہلسنت حضرت علامہ سید ارشد سعید کاظمی دامت برکاتہم العالیہ کی عنقریب منظرِ عام پر آنے والی سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا ایک حصہ ہے جس کی تکمیل میں ابھی کچھ وقت مزید درکار تھا۔

فی الوقت آپ کے برادرِ اکبر حضرت صاحبزادہ ڈاکٹر سید راشد سعید کاظمی مدظلہ العالی کے شدید اصرار پر اس حصے کو عوام الناس کے استفادہ کیلئے فوری طور پر علیحدہ شائع کیا جارہا ہے۔

اس میں حضرت موصوف نے عام روایتی انداز سے ہٹ کر ایک منفرد اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے، جس میں پہلے فلسفۂ قدیم اور جدید سائنس کے حوالے سے وسیلہ کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر قرآن وحدیث اور مسلّمہ اکابرین ملت کے تعامل سے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ (چونکہ مصنف موصوف علم کلام سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ بات ان کی اس تصنیف سے نمایاں نظر آتی ہے)

یقیناً یہ مضمون ہر سلیم الطبع شخص کیلئے اس مسئلہ میں پیدا کئے جانے والے شکوک وشبہات کے ازالہ کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوگا۔

فقیر حافظ محمد عبدالرزاق نقشبندی

انتساب

''کتاب الوسیلہ'' جو کہ در حقیقت فقیر کی عنقریب منظرِ عام پر آنے والی سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا ایک جزء ہے، اس کا انتساب باب العلم اسد اللہ سیدنا و مرشدنا ابوتراب علی بن ابی طالب حیدر کرار کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے کرتا ہے اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں عرض گزار ہے کہ میرے بیٹے سید محمد اُحد سعید کاظمی کے ذریعے سے اُس کے دادا غزالیٔ زماں رازیٔ دوراں امام اہلسنت کی مسند علم وعرفان کو تادیر آباد رکھے۔

آمین

بجاہِ عم رسول اللّٰہ سید الشھداء

سیدنا حمزۃ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ

فقیر سید ارشد سعید کاظمی

خادم الحدیث جامعہ اسلامیہ عربیہ

انوار العلوم ملتان پاکستان

۳۔شوال المکرم ۱۴۲۹ھ

بمطابق ۳۔اکتوبر ۲۰۰۸ء

اس مختصر مقالے میں قرآن و حدیث، فلسفہ قدیم اور جدید سائنس کی روشنی میں ہم وسیلہ کے بارے میں ایک مضبوط اور حسین کلام پیش کرتے ہیں جسے ہر معتدل ذہن اور تعصب کو بالائے طاق رکھنے والا شخص یقیناً پسند کرے گا۔

اِس سلسلے میں درج ذیل امور کی وضاحت کی جائے گی

(۱) وسیلہ سے کیا مراد ہے؟

(۲) جب اللہ تعالیٰ ہماری رگِ جاں سے بھی زِیادہ قریب ہے تو ہمیں اُس کی طرف وسیلہ پکڑنے کی کیا ضرورت ہے؟

(۳) کیا وسیلہ کا ماننا اور وسیلہ پکڑنا شرعاً اور عقلاً ہم پر ضروری ہے؟

(۴) کیا محض اعمالِ صالحہ ہی وسیلہ ہیں یا فرشتے، مقدس اِنسان اور ان کے علاوہ دیگر تبرکات کو بھی وسیلہ بنایا جاسکتا ہے؟

(۵) جو لوگ اِس دُنیا سے پردہ فرما گئے کیا اُنہیں وسیلہ بنایا جاسکتا ہے؟

(۱) وسیلہ سے کیا مراد ہے؟

جس ذریعے سے کسی کا قرب حاصل کیا جائے وہ ذریعہ وسیلہ ہوتا ہے۔ اِس کی وضاحت یہ ہے کہ قرب کا چاہنے والا جس ذریعے کو حصولِ قرب کے لئے اپناتا ہے وہ ذریعہ اُس کے لئے وسیلہ ہوتا ہے۔

(۲) جب اللہ تعالیٰ ہماری رگِ جاں سے بھی زِیادہ قریب ہے تو ہمیں اس کی طرف وسیلہ پکڑنے کی کیا ضرورت ہے؟

سادہ لوح مسلمانوں کو یہ بات کہہ کر اس مغالطے میں ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دیکھو جب اللہ تعالیٰ ہماری جانوں سے بھی زِیادہ قریب ہے تب ہمیں اس

کی طرف کسی نبی یا ولی کو وسیلہ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن افسوس تو اپنے سادہ لوح بھائیوں کی ذہنیت پر ہے۔ کم از کم انہیں اتنا تو سوچ لینا چاہئے تھا کہ جو لوگ نبیوں اور ولیوں کو وسیلہ بنانے سے روکنے کے لئے ہمیں یہ بات کہہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب ہماری جانوں سے بھی زِیادہ قریب ہے تب ہمیں کسی نبی یا ولی کو وسیلہ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ تو یہ بات محض یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس سے تو یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ ہم نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور دیگر احکامِ شرع پر بھی عمل پیرا نہ ہوں کیونکہ ہم اِن پر اِس لئے کار بند ہوتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہو جائے اور جب اللہ تعالیٰ ہماری جانوں سے بھی زیادہ ہم سے قریب ہے تب ہمیں نماز، روزہ و دیگر احکامِ شرع کی ادائیگی اور ان کی پاسداری کی کیا ضرورت ہے کیونکہ مقصود تو اللہ تعالیٰ کا قرب ہے اور وہ تو ہماری رگِ جاں سے بھی زِیادہ قریب ہے۔ یعنی اُس کا قرب تو ہمیں ان اُمور کے بغیر بھی حاصل ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ ہمیں قربِ خداوندی کے لئے ایمان لانے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ اس طرح کہ اللہ ربُّ العالمین نے درج ذیل دو آیتوں میں اپنے بندوں سے اپنے قریب ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ جبکہ وہاں پر ایمان کی شرط بھی نہیں رکھی یعنی یہ نہیں فرمایا کہ جب مومنین آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو آپ فرمادیں کہ میں قریب ہوں اور اسی طرح یہ بھی نہیں فرمایا کہ ہم مومنین کی رگِ جاں سے زِیادہ قریب ہیں بلکہ ان آیات میں مطلقاً اِنسان اور اپنے عباد (بندوں) کا ذکر فرمایا ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اِنسان اور عباد کے یہ دونوں الفاظ تمام افراد اِنسان کو تو شامل ہیں ہی۔ چاہے وہ مومن ہوں یا کافر۔ پس اِس بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ حصولِ قرب خداوندی کے لئے اِیمان کا ہونا بھی ضروری نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں سے قریب ہے چاہے وہ مومن ہوں یا کافر۔

لیجئے اب وہ آیات ملاحظہ ہوں جن میں قربِ خداوندی کو محض مومنین کے ساتھ خاص نہیں کیا گیا بلکہ اِنسان یا عباد کے کلمات اِرشاد فرمائے گئے۔

سورۂ قٓ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ج وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ. (قٓ، آیت ۱۶)

''اور بے شک ہم نے اِنسان کو پیدا کیا اور ہم ان وسوسوں کو (بھی) جانتے ہیں جو اس کا نفس امارہ (اس کے دِل میں) ڈالتا رہتا ہے اور ہم اِس (اِنسان) کی شہ رگ سے زِیادہ اس کے قریب ہیں۔''

اور اسی طرح فرمایا

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِيْبٌ ط (البقرۃ، آیت ۱۸۶)

''اور (اے حبیب) جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے دریافت کریں تو (آپ فرمادیں کہ) بے شک میں (ان کے) قریب ہوں۔''

واضح رہے کہ اس آیت کا شانِ نزول اگر چہ خاص ہی کیوں نہ ہو مگر اس کے حکم میں عموم ہے اور جب تک کوئی دلیل خصوص نہ پائی جائے اس وقت تک آیت کریمہ کے حکم میں تخصیص پیدا کرنا جائز نہیں ہوتا اور یہاں پر کوئی ایسی حتمی اور یقینی دلیل نہیں پائی جاتی جس کی بناء پر ہم اس مطلق حکم کو مقید کر لیں۔

اگر یہاں پر یہ اعتراض کیا جائے کہ آیت کریمہ کے اگلے جزء

اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِیْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ. (البقرۃ، آیت ۱۸۶)

''دُعا کرنے والے کی دُعا کو میں (اپنی حکمت کے مطابق) قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دُعا کرے تو چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر اِیمان رکھیں تا کہ وہ کامیابی حاصل کریں۔''

سے یہ بات ثابت ہورہی ہے کہ یہاں پر عباد سے مراد محض مومنین ہیں کیونکہ اِس جگہ اللہ تعالیٰ کے دُعا کو قبول فرمانے کا ذِکر ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین ہی کی دُعا کو قبول فرماتا ہے۔

اِس بارے میں اتنا عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ محض مومنین کی ہی دُعاؤں کو قبول نہیں فرماتا بلکہ وہ کافروں کی دُعاؤں کو بھی اپنی حکمت کے مطابق قبول فرماتا ہے۔ ہاں! دُعا کے ثمرات کے صحیح مستحق بننے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اِرشاد فرمایا

فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔ (البقرة، آیت ۱۸۶)

"(جب وہ مجھ سے دُعا کریں) تو چاہیئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر اِیمان رکھیں تا کہ وہ کامیابی حاصل کریں۔"

غیر مسلموں کی دُعاؤں کی قبولیت کے اثرات کے ظہور کا تجربہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مختلف علاقوں میں بارہا مرتبہ کیا گیا۔ اس کی تفصیلات پر مشتمل ڈاکٹر پیٹر فینوک (Dr. Peter Fenwick) کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے جس میں وہ کہتے ہیں

چونکہ ہماری یہودی، مسیحی سوسائٹی میں دُعا کو ہمیشہ سے مایوسی ختم کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ دُعا کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے ہم اپنے مضمون کا آغاز اس واقعے سے کرتے ہیں جو ایک صدی قبل ہوا۔

یہ کہانی 1880ء میں امریکہ کے مغربی علاقے کے ایک وکیل نے بیان کی کہ امریکہ کا ایک علاقہ بہت عرصہ سے خشک سالی کا شکار تھا اور اس قحط نے کسانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ یہ بھی امکان تھا کہ اگر کچھ عرصہ مزید بارش نہ ہوئی تو تمام کھیتی باڑی تباہ ہو جائے گی۔ پس بہت سارے مذہبی پیشواؤں نے کافی سوچ بچار کے بعد یہ منصوبہ بنایا کہ ایک مخصوص دِن حلقہ کے تمام لوگ بارش کے لئے دِن کے دُوسرے پہر

میں دُعا مانگیں گے۔اس مخصوص دِن علاقہ کے تمام لوگ ایک مخصوص جگہ اِکٹھے ہوئے اور بارش کے لئے دُعا مانگی۔ چند ہی گھنٹوں میں بادل گھر آئے اور گھن گرج کے ساتھ بارش برسی۔ گرج چمک اِتنی شدید تھی کہ آسمانی بجلی نے ایک فارم کو جلا دِیا جو کہ بدقسمتی سے بیمہ شدہ بھی نہیں تھا۔ چونکہ اس فارم کا مالک اثر ورسوخ کا حامل شخص تھا۔ پس اس نے اُس پادری کے خلاف دعویٰ دائر کروا دِیا جو اس دُعا کے انعقاد میں پیش پیش تھا۔

اس شخص نے اس واقعہ کے راوی کو وکیل بنایا۔ اس مقدمہ کا امریکہ میں بہت چرچا ہوا اور بالآخر مقدمہ امریکہ کی سپریم کورٹ (اعلیٰ عدالت) تک جا پہنچا۔ جج نے مدعی سے پوچھا

آیا وہ دُعا پہ اعتقاد رکھتا ہے؟

پہلے تو مدعی اِنکاری ہوا مگر یہ سوچ کے کہ یہ اِنکار اس کے حق میں مضر ثابت ہوگا اس نے اثبات میں جواب دِیا۔

جج نے مزید پوچھا کہ کیا بارش کے لئے کی گئی دُعا میں تم شامل تھے؟

مدعی: ہاں۔

جج: کیا بجلی گرنے کی دُعا بھی کی گئی تھی؟

مدعی: نہیں۔ آپ نے یہ کیوں پوچھا؟

جج نے یہ کہتے ہوئے مقدمہ ختم کر دیا کہ ''بجلی کا چمکنا اور گرنا ایک خدائی فعل ہے۔''

1872ء میں سر فرانسس گالٹن نے دُعا کے اثرات کی اہمیت کو سائنسی نقطۂ نظر سے جانچنے کے لئے ایک سروے کیا۔

اس سروے کا مضمون تھا

''عبادت گزار، دراز عمر ہوتے ہیں''

اس سروے سے گالٹن اس نتیجے پر پہنچا کہ دعا پر یقین رکھنے والے افراد

(پادری) زِیادہ طویل عمر ہوتے ہیں، ڈاکٹرز اور وکلاء کے مقابلہ میں جو دُعا پر یقین نہیں رکھتے۔ اور اِس کی وجہ یہ نہیں کہ عام افراد کا طرزِ زندگی زیادہ بہتر ہے۔ اِس بات کو سمجھانے کے لئے گالٹن نے یورپ کے حکمرانوں اور رعایا کے بارے میں ایک سروے کیا۔ یورپ میں حکمرانوں کے لئے دُعا کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا تھا اور رعایا اس کام پر معمور تھے۔ لیکن یہ عجب بات تھی کہ حکمرانوں کی عمریں اُن کی رعایا کے مقابلہ میں کم رہیں جبکہ عام لوگوں کی عمریں مقابلۃً زیادہ نوٹ کی گئیں۔

امریکہ کے جدید جریدہ بی ایم جے BMJ نے معجزے پر دو تحقیقی رسالے شائع کئے جو بلاشبہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سینٹ ''تھامس'' نے معجزے کو دُعا سے منسلک کیا ہے۔ مزید برآں ان میں گارڈنر نے ''تھامس'' سے سوال کیا کہ اب (Healing Miracles) تندرست کرنے والے معجزات کیوں رونما نہیں ہوتے؟ تو اس پر سینٹ ''تھامس'' نے یہ روایت بیان کی کہ عیسائی مبلغ ''ایتھوپیا'' میں کچھ الہامی کتابوں کے نمونے چھوڑ آئے تھے جس میں کرامات اور معجزات کا بالخصوص ذکر تھا۔ یہ لوگ سادہ لوح تھے۔ انہوں نے اسی کتاب کے مطابق زِندگی گزارنا شروع کر دی اور وہ معجزات پر یقین کامل رکھتے تھے۔ جب عیسائی مبلغ کچھ عرصہ کے بعد وہاں دوبارہ آئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہاں روزانہ معجزات رونما ہو رہے ہیں (کیونکہ ان ایتھوپیا کے معصوم لوگوں کا دِماغ کسی معجزات کے انکاری، جدت پسند شخص نے آلودہ نہ کیا تھا۔) گویا لوگوں کے پختہ عقائد کی بناء پر کرامات اور معجزات رونما ہو رہے تھے۔

پچھلی دو دہائیوں میں لوگوں کی توجہ روحانی اقداروں کی طرف مبذول ہوئی۔ اس کی مثال بائرڈ ایٹ آل کے 1988ء کا شمارے کا وہ مضمون ہے جس میں اس نے اس روحانی بیداری اور مذہبی قربت پر روشنی ڈالی اور یہ بات تسلیم کروائی کہ

حقائق اور واقعات کی بنا پر جن ہسپتالوں میں مریضوں کے لئے دُعائیں کی جاتی ہیں اُن ہسپتالوں میں صحت یاب ہونے والے مریضوں کی تعداد زِیادہ ہوتی ہے۔ اور مزید یہ کہ بیماریاں و پیچیدگیاں کم سے کم اور دوا کے استعمال میں کمی واقع ہوتی ہے۔

امریکہ میں دُعا پر بہت یقین اور بھروسہ کیا جاتا ہے۔ نیوز ویک رسالے نے 1992ء کے شمارے میں یہ بات کہی کہ 10 میں سے 9 امریکی ہر ہفتے باقاعدگی سے دُعا مانگنے کے لئے چرچ جاتے ہیں (واضح رہے، وہاں دُعا اتوار کے دِن مانگی جاتی ہے) لائف میگزین کے 1994ء کے شمارے نے یہ بات ثابت کی کہ 90% لوگوں کا یقین ہے کہ خدا اُن کی دُعائیں سنتا ہے اور قبول بھی کرتا ہے۔ ٹائمز رسالے کے 1996ء کے ایڈیشن میں یہ بات ثابت ہے کہ 82% لوگوں کا دُعا سے صحت یاب ہونے پر اعتقاد ہے بلکہ پختہ یقین ہے۔

کوئنگ (1999) لکھتا ہے کہ دُعا کی افادیت یہ ہے کہ یہ مضبوط جسمانی مدافعتی نظام کا سرچشمہ ہے جس کے باعث دِل اور کینسر جیسی موذی بیماریوں کے خلاف قوتِ مدافعت بڑھنے کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ ایک مضبوط تر اِیمان اور قابل بھروسہ سماجی نظام ہی بہتر رِشتوں، مثبت سوچ، بہتر جسمانی مدافعتی نظام، بیماریوں سے نجات اور اعلیٰ جسمانی قوت کو فروغ دیتا ہے۔

امریکہ کی ایک اور ریسرچ میں جو کہ دُعا کرنے کے عقیدے کے خلاف تھی اور زیادہ تر سائنس کے اصولوں پر مبنی تھی، یہ کہا گیا کہ دُعا کی افادیت کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ دُعا کی افادیت نہ ہونے کا بھی کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا۔

بائرڈ ایٹ آل (1988) کے نظریۂ دُعا کا اطلاق ایک اِنتہائی نگہداشت کے یونٹ میں کیا گیا اور اُس کے نتائج حیران کن تھے۔ چند قریب المرگ مریضوں

کے نام منتخب کر کے دُعا کرنے والے گروپ کو بھیجے گئے کہ وہ ان کے لئے دُعا کرے اوران کی دُعا کے اثرات کچھ اِس طرح سے ظاہر ہوئے کہ اینٹی بائیوٹک کے استعمال میں 5 گنا کمی واقع ہوئی۔ تین گنا کمی Pulmonaryoedema کے مرض میں واقع ہوئی اوراس دوران ان میں سے بہت کم لوگوں کی موت واقع ہوئی اور عام صحت میں افاقہ بھی نوٹ کیا گیا۔ یہ رپورٹ مزید طبی سائنسی تحقیق کا باعث بنی۔

1999ء میں حیرث نے 999 دِل کے مختلف مریضوں پر تحقیق کی۔ ان میں سے چندلوگوں کے نام انہیں بتائے بغیر مقامی چرچ میں دُعا کیلئے دیئے گئے جبکہ ہسپتال میں تمام مریضوں کوان کی ضرورت کے مطابق بہترین طبی امداددی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد نتائج کا موازنہ کیا گیا۔ وہ لوگ جن کے نام چرچ میں دیئے گئے تھے اور جن کیلئے دُعا کی گئی تھی ان میں سے بہت سے لوگ جلد صحت یاب ہو گئے۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جن کے لئے دُعا نہیں کی گئی تھی۔ (i)

ہماری سابقہ عبارت سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ قرآنِ مجید اور مذکورہ بالا تجربات سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ محض مومنین ہی کی دُعاؤں کو قبول نہیں فرماتا بلکہ وہ کافروں کی دُعاؤں کو بھی قبول فرماتا ہے اوراس کی ایک دلیل سورۂ شوریٰ کی یہ آیت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِرشادفرمایا

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ o

''جوشخص دُنیا کی کھیتی کاارادہ کرتا ہے،ہم اس کواس میں سے کچھ دے دیتے ہیں اوراس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔'' (آیت ۲۰)

جب کہ قرآن کریم کی دیگر آیات سے بھی ثابت ہے کہ کفار کی تو زِندگی

(i) Reference:
Scientific Evidence for the Efficacy of Prayer.
Dr. Peter Fenwick

صرف دُنیا کی ہے کیونکہ آخرت میں تو وہ ایسی کیفیت میں ہوں گے کہ نہ تو وہاں مر سکیں گے اور نہ ہی جینے کی کوئی لذت ان کے لئے ہوگی جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں ہے

لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی۔

''نہ وہ وہاں مرے گا اور نہ جئے گا۔'' (آیت ۷۴)

لٰہذا اگر وہ صحت وغیرہ امورِ دُنیا سے متعلق کوئی دُعا مانگیں اور وہ قبول کر لی جائے تو کوئی بعید از قیاس نہیں بلکہ اس سے تو اللہ کے خالق و مالک ہونے کا اور دُنیا میں اس کی رحمتِ عامہ کا اظہار ہوتا ہے۔ رہا آخرت کا معاملہ تو اس کے لئے یہ صراحت آ گئی کہ

وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ۝

کہ ''آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔'' (آیت ۲۰)

مزید یہ کہ قرآن پاک سے تو یہاں تک ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ محض عام کافروں کی دُعاؤں کو ہی قبول نہیں فرماتا بلکہ اُن کے گُرو گھنٹال سر چشمۂ کُفر وضلالت، انبیاء کا پہلا گستاخ، شیطان رجیم کی دُعا کو بھی قبول فرمالیتا ہے۔ جیسا کہ اس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے۔ رَبُّ العالمین نے اِرشاد فرمایا

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ۝ قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ۝ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ۝ (الحجر، آیت ۳۶، ۳۷، ۳۸)

''(شیطان) بولا! اے میرے رب تو مجھے اُس دِن تک کی مہلت عطا فرما جبکہ وہ اُٹھائے جائیں۔ (تو) رَبُّ العالمین نے فرمایا بے شک تو اُن میں سے ہے جن کو مہلت دی گئی۔ وقتِ معلوم کے دِن تک۔''

اگر چہ اللہ رَبُّ العالمین نے شیطان کی درخواست کو مکمل طور پر قبول نہیں فرمایا اس کے باوجود اس میں ایک حد تک قبولیت کا پہلو نمایاں ہے کہ شیطان نے

"اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ" میدانِ محشر تک چھوٹ مانگی تھی جبکہ اللہ ربُّ العالمین نے "وقت معلوم" یعنی قیامت تک چھوٹ عطا فرمائی یا یوں کہہ دیا جائے کہ جس دِن شیطان کی رُوح قبض کی جائے گی، اُس دِن تک کی مہلت عطا فرمائی اور اس کے بعد پھر قیامت کا برپا ہو جانا ہے۔

واضح رہے کہ قیامت کا دِن وہ ہے جب پہاڑ رُوئی کے گالوں کی طرح اُڑنے لگیں گے۔ سورج لپیٹ دِیا جائے گا۔ ستارے بکھر جائیں گے۔ جب جانور بھی پریشان حال گھومتے نظر آئیں گے۔ جب زمین میں بھونچال اور زلزلے پیدا ہو جائیں گے۔ پھر چالیس برس تک کچھ نہ ہوگا۔ اُس کے بعد حشر برپا ہوگا جس میں جانیں جوڑی جائیں گی۔ زِندہ دفنائی ہوئی بچیوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کس جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا اور اعمال نامے کھول دِیئے جائیں گے۔ جہنم دَہکا دی جائے گی اور جنت آنکھوں کے لئے سجا دِی جائے گی۔ میزانِ عدل رکھ دِیا جائے گا اور ہر شخص اپنے کئے کو پالے گا۔

اب ہم اپنی اُسی پہلی بات کی طرف لوٹتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ ہم سے قریب ہے تب ہمیں کسی وسیلے کی کیا ضرورت ہے تو واضح رہے کہ ایسا عقیدہ رکھنے والوں کو نماز، روزہ احکامِ شرع کی بجا آوری، یہاں تک کہ حصولِ قربِ خداوندی کے لئے اِیمان لانے کی بھی ضرورت نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر شخص سے قریب ہے چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر۔ یہ ساری خرابی اِس لئے لازم آئی کہ لوگوں نے وسیلے کا اِنکار کرنا شروع کر دِیا۔

اس سابقہ عبارت کو پڑھ لینے کے بعد فطرتِ سلیمہ کے حامل افراد اس بات سے بخوبی واقف و آگاہ ہو گئے ہوں گے کہ وسیلہ کے انکار کرنے والے شخص کے نزدیک دِینِ اِسلام کی کوئی بھی اہمیت نہیں رہتی ہے اور عبادات کا تصور بالکل کھوکھلا

اور عبد و معبود کا رِشتہ بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تحریر کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اِس قسم کے اعتراضات انبیاءِ عظام اور اولیاءِ کرام سے عداوت کی بناء پر ہی کئے جا سکتے ہیں۔

بالفاظِ دیگر:- اب ہم اِسی اعتراض اور اس کے جواب کو دوسرے زاویئے سے پیش کرتے ہیں تا کہ ہماری اِس تحریر کے پڑھنے والے کی مکمل تسلی اور تشفی ہو جائے۔

جب اللہ تعالیٰ ہماری رگِ جاں سے بھی زِیادہ قریب ہے اور یہ بات بالکل ظاہر ہے جو پہلے ہی سے بے پناہ قریب ہو اُس سے قریب ہونے کے لئے رابطے اور وسیلے تلاش کرنا حماقت اور بے وقوفی ہوتی ہے۔

اِس بارے میں صرف اِتنا عرض ہے کہ ایسی باتیں بنانے والوں کو قُرب اور بُعدِ خُداوندی کی معرفت ہی حاصل نہیں ہے اور نہ ہی اُنہوں نے اس مفہوم کو جاننے کے لئے اُن لوگوں کی طرف رجوع کیا ہے جو قُربِ الٰہی کی چاشنی اور مزے میں ہمہ وقت سرشار اور مُستغرق رہتے ہیں۔ حالانکہ حق تو یہی بنتا تھا کہ سوال اُسی سے کیا جائے جو اُس راہ کا راہی ہو، مگر یہاں تو ندیا اُلٹی بہہ رہی ہے کہ کسی سے اس راہ کا سوال کرنا جرم اور گناہ بن گیا ہے کیونکہ جس سے بھی ہم پوچھیں گے اور وہ ہمیں اس راہ کا پتہ بتائے گا تو لازماً وہ ہمارے لئے بارگاہِ اِلٰہی میں وسیلہ بن جائے گا۔ جبکہ مُنکرینِ وسیلہ اسی وسیلے کا تو اِنکار کرنے نکلے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ اُن کے نزدیک کسی سے اس بارے میں پوچھنا اور سوال کرنا بھی جرم ہے۔

مزید یہ کہ ایسا کہنے والے اپنے زِیادہ عقلمند ہونے کو ظاہر کرنے کے لئے عقل کو بے جا خرچ کرنے لگے ہیں جبکہ یہاں اُن عقلی موشگافیوں کی قطعاً ضرورت نہ تھی بلکہ کسی ہادی، راہنما اور رہبر کی ضرورت تھی جو ایک کرم کی نگاہ ڈال کر انہیں بارگاہِ رَبُّ العزت میں پہنچا دے۔

مزید یہ کہ قرب اور بُعدِ خداوندی سے متعلق مغالطے دیتے رہنا یہ منکرین وسیلہ کا ہمیشہ سے شیوہ اور طریقہ رہا ہے۔

تعجب ہے کہ انہوں نے اس چیز کی طرف غور نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کا ہم سے قریب ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بھی اللہ تعالیٰ کے قریب ہیں۔ ہاں، اگر یہ کہا جائے کہ جب ایک شے دُوسری شے سے قریب ہوتی ہے تو لازماً دُوسری شے بھی پہلی شے سے قریب ہوگی۔ یعنی یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ہم سے قریب ہو مگر ہم اُس سے قریب نہ ہوں۔

اِس سلسلے میں ہم اِبتدائی طور پر ایسا کلام پیش کریں گے جو ان سادہ لوح لوگوں کے لئے کافی و شافی ہو جائے جو مخالفین وسیلہ کے میٹھے میٹھے بول اور شیریں زبانوں کی نذر ہو چکے ہیں۔ پھر اِن شاء اللہ العزیز قربِ خداوندی کے مفہوم کی وضاحت کی جائے گی۔

ملاحظہ ہو کہ یہاں غیر محسوس کو محسوس پر قیاس کیا گیا ہے جو کہ درست نہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غیر محسوس ہے کیونکہ اگر وہ محسوسات میں سے ہوتا تب تو ہر شخص اس کو اپنے حواس کے ذریعے سے محسوس کر لیتا اور کسی صاحب شعور کے لئے اُس کی ذات کا اِنکار کرنا ممکن نہ رہتا جبکہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور عدم یعنی ہونے یا نہ ہونے پر دانشمندوں میں اختلاف ہوتا چلا آیا ہے جو کہ آج تک بھی لوگوں کے مابین بحث و تمحیص کا بازار گرم کئے ہوئے ہے۔ جبکہ دُنیا نے بے پناہ ترقی کر لی ہے اور ایسے آلات بنا لئے ہیں جو ان میں سے بعض چیزوں کو بھی محسوس کر لیتے ہیں کہ جنہیں پانے کے لئے ہمارے حواس ناقص و ناتمام ہیں۔ اس کے باوجود بھی اہل دُنیا کی رسائی اس ذات تک نہ ہو سکی۔ لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ از قبیل محسوسات نہیں۔ اس لئے اُس کے قرب اور بُعد کو دیگر اشیاء کے باہمی قرب و بُعد پر قیاس کرنا درست نہیں۔

اس کی دُوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جب عام چیزوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے فلاں چیز فلاں چیز سے قریب ہے یا بعید۔ تب اُن میں سے ہر ایک چیز دوسرے کے مدمقابل اور سامنے ہوتی ہے۔ اگرچہ کہ وہ ایک دوسرے سے آکر چپک ہی کیوں نہ جائیں پھر بھی اُن میں جانب، جہت اور طرف کا اعتبار رہتا ہے کہ ایک شے ایک طرف ہے اور دُوسری شے دُوسری طرف۔ کیونکہ اگر آپ اُن میں طرف، جانب اور جہت تسلیم نہیں کریں گے تو اس کا معنیٰ یہ ہو جائے گا کہ وہ دونوں چیزیں ایک ہی جانب اور ایک ہی طرف ہیں یعنی دونوں کے لئے پھر ایک ہی جگہ اور ایک ہی مکان تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ اگر دونوں کی جگہ آپ نے الگ الگ مان لی تب ان دونوں کا مختلف جانبوں میں ہونا بھی ماننا پڑے گا۔ اس لئے کہ اگر آپ جانب اور جہت تسلیم نہیں کریں گے تو اس صورت میں کوئی چیز دُوسرے کے مدمقابل قرار نہ پائے گی۔ لہٰذا ان چیزوں میں قرب اور بعد کا تصور بھی باقی نہ رہے گا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی جہت، جہت نہیں اور کوئی جانب، جانب نہیں۔ وہ ہر جانب، ہر طرف، ہر جہت میں ہر وقت موجود ہے۔ لہٰذا اُس کے قریب اور دُور ہونے کو دُوسری چیزوں کے قریب اور دُور ہونے کی طرح سمجھنا اور ان پر قیاس کرنا درست نہیں۔ ورنہ تو اللہ تعالیٰ کے لئے جہت، جانب وغیرہ تسلیم کرنی پڑ جائے گی جبکہ اس بات کی وضاحت تو رب العالمین نے قرآن مجید میں فرمادی ہے۔

جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ط (البقرۃ، آیت ۱۱۵)

ترجمہ: ''تم جہاں کہیں رُخ کرو گے وہیں اللہ کو پاؤ گے۔''

ہاں اگر یہ کہا جائے کہ بعض اوقات ایسا قرب بھی ہوتا ہے جس میں جانب، جہت کا لحاظ نہیں رکھا جا سکتا۔ مثلاً پانی کو دُودھ میں ڈال دِیا جائے تو پانی اور دُودھ کے

قرب میں جانب جہت کا تصور ممکن نہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس مثال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو مخلوق پر قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ جب دُودھ میں پانی ملایا جاتا ہے تو پانی کا ہر ہر قطرہ دُودھ بن جاتا ہے۔

اس صورت میں اب پانی اور دُودھ میں دوئی کا تصور ختم ہو جاتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے بارے میں اس قسم کا تصور کرنا قطعاً درست نہیں کہ یوں کہا جانے لگے کہ اللہ بندہ بن گیا یا بندہ اللہ، العیاذ باللّٰہ. پس ثابت ہوا کہ اللہ اور بندے کے درمیان ایسے قرب کا تصور کرنا کہ ان میں خاص اتحاد کے باعث جانب اور جہت کا تصور ختم ہو جائے اور دوئی کا تصور جاتا رہے قطعاً درست نہیں۔اس قسم کے قرب کو حلول اور تداخل کہا جاتا ہے اور چونکہ یہ مقام اس بحث کا متحمل نہیں اور اس کی تفصیل اس وقت بحث لا حاصل ہوگی اس لئے محض اہل علم کے لئے صرف اِتنا جملہ لکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے مابین نا حلولِ سریانی جائز ہے اور نہ ہی حلول طریانی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لئے کسی بھی قسم کے حلول کا عقیدہ رکھنا جائز نہیں۔(اس کی تفصیل جاننے کے لئے اہل علم، فلسفہ اور علم کلام کی مایۂ ناز کتب کی طرف رجوع فرمائیں)۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اس کی مزید تشریح تصوف کے معرکۃ الآرا مسئلہ ''وحدت الوجود'' میں کی جائے گی۔

ہاں! اس تمام تر وضاحت کے باوجود بھی اگر یہ کہا جائے چونکہ اللہ تعالیٰ ہم سے قریب ہے اس لئے ہم بھی اس کے قریب ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہر شخص کو خود بخود حاصل ہو جانی چاہئے کیونکہ وہ رب کے قریب ہے تو ایسی صورت میں یہ خرابی لازم آئے گی کہ رسولوں کا بھیجا جانا، کتابوں کا نازل فرمانا بالکل بے فائدہ ہو کر رہ جائے گا کیونکہ مقصد تو رب العالمین کا قرب ہے اور وہ تو ہمیں ان کے بغیر خود بخود حاصل ہے۔

اب ہم آپ کے سامنے اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہمارے قریب ہونے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ہم بھی اس کے قریب ہوں۔

ملاحظہ ہو ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط (پ ۲ س ۲ البقرة آیت ۱۸۶)

ترجمہ: کہ جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے پوچھیں تو آپ فرمادیں کہ میں قریب ہوں۔

اس آیت کریمہ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں سے قریب ہے مگر اس کے بندے اس سے قریب نہیں کیونکہ بندوں کا اللہ تعالیٰ کے متعلق سوال کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ سے قریب نہیں۔ اگر وہ قریب ہوتے تو رب کے متعلق اس طرح نہ پوچھتے بلکہ انہیں پہلے سے اس بات کا علم ہوتا کہ ہم اپنے رب کے قریب ہیں اور مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (کہ میں قریب ہوں) فرما کر یہ بات واضح کردی کہ میں تو تم سے قریب ہوں مگر تمہارا مجھ سے قریب نہ ہونے کی بناء پر تمہیں میرے قرب کا ادراک اور شعور نہیں۔ یعنی میرے قریب ہونے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ تم بھی مجھ سے قریب ہو۔ ہاں! اگر یہ کہا جائے کہ بندہ تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہوتا ہے مگر اسے احساسِ قرب نہیں ہوتا یعنی یوں نہ کہا جائے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے قریب نہیں۔ اس بارے میں اتنا عرض ہے کہ اسی احساسِ قرب ہی کو تو اللہ تعالیٰ کا قرب کہا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا جسم تو ہے نہیں کہ ہمیں اس کا جسمانی قرب نصیب ہو سکے بلکہ اس کے قرب کا مطلب اس کی معرفت و پہچان اور اس کے جلووں کو اپنے اندر محسوس کر لینا ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ وہ چیزیں جنہیں محض روح محسوس کرے لیکن ہمارے حواس کی اُن تک رسائی نہ ہو، وہ محسوسات میں سے نہیں ہوتی ہیں۔

حقیقت بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

اس بارے میں بس صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ اس کے قرب کی بناء پر انسان ایسی خاص لذت اور کیفیت محسوس کرتا ہے جس کے اثرات بعض اوقات اس کے جسم سے بھی عیاں ہوتے ہیں اور اس کی کیفیت کا کچھ بیان سورۃ الزمر آیت ۲۳ میں کیا گیا ہے۔

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِھًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْہُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ ج ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُھُمْ وَقُلُوْبُھُمْ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ ط ذٰلِکَ ھُدَی اللّٰہِ یَھْدِیْ بِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ط وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَالَہٗ مِنْ ھَادٍ O

(پ ۲۳ س ۳۹ الزمر آیت ۲۳)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اتارا بہترین کلام یعنی ایسی کتاب جس کی تمام باتیں ایک جیسی ہیں بار بار دہرائی ہوئی۔ اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر ان کی کھالیں اور ان کے دِل نرم ہو کر اللہ تعالیٰ کے ذِکر کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ یہی اللہ کی ہدایت ہے جس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور جسے اللہ گمراہ کرتا ہے اس کیلئے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اے میرے بندو! تم مجھ سے قریب ہو بلکہ یہ فرمایا کہ میں تم سے قریب ہوں۔ پس اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو اس لئے نہیں بھیجا کہ اسے ہم سے قریب ہونے کیلئے کسی وسیلے کی ضرورت ہے بلکہ رسولوں کا مبعوث ہونا اور اُن کا بھیجا جانا اس بناء پر ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف ان مقدس حضرات کے وسیلے کی ضرورت ہے۔

اِس پوری بحث کو سمجھانے کے لئے ایک مثال پیش کی جاتی ہے جسے پڑھ لینے کے بعد یہ بات سمجھ لینا آسان ہو جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کی بناء پر

یہ بات ضروری نہیں کہ ہم بھی اُس کے قریب ہوں۔مثال ملاحظہ ہو۔

پرانے زمانے کی بات ہے کہ کسی جوہری کے ہاتھ کہیں سے نہایت قیمتی ہیرا آ گیا جس کی قیمت ادا کرنا کسی عام بادشاہ کے بس کی بات بھی نہ تھی۔لہٰذا اُس جوہری نے کسی نہایت دُور دراز علاقے کے ایک عظیم شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر اُس ہیرے کے بدلے میں انعام واکرام وصول کرنے کا ارادہ کیا۔اُس نے رختِ سفر باندھنا شروع کیا اور جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔اِسی اثناء میں کسی چور کو اس صورتِ حال کا پتہ چل گیا تو وہ جوہری کے پاس آیا اور کہا کہ اے میرے بھائی، کہاں جانے کے ارادے ہیں؟ تو جوہری نے کہا کہ فلاں شہر جا رہا ہوں۔چور نے کہا، اُوہ! مجھے بھی تو اُسی طرف جانا ہے۔جوہری چور کے عزائم اور اِرادے کو بھانپ گیا اور سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے۔پس اُس نے الگ الگ جانے کے لئے ہزار پینترے بدلے اور کئی بہانے تراشے۔مگر چور کہاں ٹلنے والا تھا۔اُس نے کہا، جوہری صاحب، ایک مہینے کا سفر ہے، ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں اور سفر کے ہزار معاملات ہوتے ہیں۔اکٹھے چلتے ہیں یعنی چور جوہری کے ساتھ بالکل لسوڑا ہو گیا۔بالآخر جوہری بیچارہ مروت کا مارا چور کے ہاتھوں زِچ اور مجبور ہو گیا۔پس دونوں سفر پر روانہ ہوئے۔جب رات ہوئی تو دونوں نے آپس میں باتیں کرتے ہوئے کہا کہ بھائی، اگر دونوں سو گئے تو کوئی ہمیں لوٹ لاٹ لے گا اور اگر دونوں جاگے تو کب تک جاگیں گے۔آخر ایک مہینے کا سفر ہے۔بالآخر یہ بات طے پائی کہ آدھی آدھی رات سفر میں باری باری سوئیں گے اور جاگنے والا پہرہ دے گا۔جوہری نے چور سے کہا کہ آپ پہلے سو جایا کرو۔میں پچھلی رات میں سویا کروں گا۔بس جوہری نے چور کو سلا دِیا۔کیونکہ اُس زمانے میں سفر بھی اِنتہائی دُشوار گزار اور پُر کٹھن ہوا کرتا تھا۔ظاہر ہے چور دِن بھر کا تھکا ہارا جیسے سونے کے لئے لیٹا تو دیکھتے ہی دیکھتے گہری نیند میں چلا گیا۔اِس پہلی

رات جوہری کبھی اپنے ہیرے کی طرف دیکھتا اور کبھی سوئے ہوئے چور کے چہرے کی طرف۔ وہ بے چارا سوچ میں پڑ گیا کہ میں اپنے اِس ہیرے کو چور سے کیسے بچاؤں اور وہ دِل ہی دِل میں کہنے لگا، اب کچھ دیر بعد جب میں اس چور کو اُٹھاؤں گا اور ظاہر ہے تھکا ماندہ ہوں، جب میں بے خبر سو جاؤں گا اور یہ چور میرا ہیرا جو کہ اس وقت صرف میرا ہے چپکے سے نکال کر اچانک چمپت اور غائب ہو جائے گا اور صبح میں اس حال میں کروں گا کہ چور میرا ہیرا لے کر مجھ سے کوسوں دُور جا چکا ہو گا تو ہائے اللہ، اس وقت میرا کیا بنے گا؟ جوہری بے چارہ اس پریشان خیالی میں گم تھا کہ اچانک اُس کے دِماغ میں ایک انوکھی تدبیر آئی کہ میں یہ ہیرا چور ہی کے کپڑوں میں اس طرح کیوں نہ چھپا دوں کہ چور کو اس کا احساس تک بھی نہ ہو۔ پس اُس نے ایسا ہی کیا (کیونکہ اس زمانے میں کھدر اور اون کے موٹے موٹے لباس ہوا کرتے تھے، اِس بناء پر جوہری کو اس کام میں زِیادہ مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا) اور نہایت آسانی سے اُس نے اپنے اُس ہیرے کو چور کے کپڑوں میں چھپا دِیا۔ اب ادھر آدھی رات بیت چکی تھی۔ پس اُس نے اس چور کو اُٹھایا اور کہا بھائی اُٹھو، اب تمہارے جاگنے اور میرے سونے کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ پس وہ چور بیدار ہوا اور اُس نے جوہری سے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا، ہاں بھائی، اب تم ذرا جلدی جلدی سو جاؤ۔ ظاہر ہے نہ اُس جوہری کے پاس ہیرا تھا نہ اُسے اُس کے چوری ہونے کا ڈر تھا۔ بس وہ جیسے ہی لیٹا تو نیند نے اُسے آلیا اور وہ خراٹے لینے لگا۔ ادھر چور نے جب دیکھا جوہری گہری نیند سو چکا ہے، تب اُس نے اس کی جامہ تلاشی شروع کی۔ اُس کے کپڑوں کو ٹٹول کر دیکھا اور اُس کے سامان کی تلاشی لی۔ اُس کے پاس نہ ہیرا تھا، نہ ملا۔ بالآخر چور کی بقیہ رات اسی شش و پنج میں گزر گئی۔ جب صبح ہوئی تو دونوں کا سفر پھر سے شروع ہو گیا۔ جب قیلولہ یعنی دوپہر کے آرام کا وقت آیا تو جوہری نے چپکے سے چور کے کپڑوں میں سے اپنا ہیرا

نکال لیا اور پھر شام کو چور کے سامنے ہیرا اُچھالتا تھا، دِکھاتا تھا اور کھیلتا تھا۔ چور حیرت زدہ پریشان حال دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ میں تو ساری رات اِس ہیرے کو تلاش کر کر کے مر گیا۔ مگر نا معلوم اس نے اس کو کہاں چھپا رکھا تھا۔ بہر حال اب کے نہیں چھوڑوں گا۔ پھر جب اگلی رات آئی تو جوہری نے پھر چور کو پہلے سلا دِیا اور اسی طرح اپنے ہیرے کو چھپا دِیا اور جب آدھی رات گزر گئی تو چور کو اُٹھایا اور خود سو گیا اور پھر چور اسی طرح ساری رات جوہری کی تلاشی لیتا رہا اور پریشان رہا۔ الغرض یہ کہ دِن اِسی طرح گزرتے چلے گئے اور ہر روز قیلولہ کے وقت جوہری اپنا ہیرا نکال لیتا اور اُسے اُچھال اُچھال کے دِکھاتا اپنا دِل بہلاتا اور اس کا دِل جلاتا۔ بالآخر مہینے بھر کا سفر کٹ گیا۔ جب دونوں ساتھی جدا ہونے لگے، تب چور نے جوہری کے ہاتھ کو پکڑ لیا اور کہا کہ اے میرے بھائی، اِتنا تو بتا تا جا کہ تو اپنا یہ ہیرا کہاں چھپاتا تھا؟ تو جوہری نے اس کو جواب دِیا کہ اے میرے بھائی، ہیرا تو تجھ سے قریب ہوتا تھا مگر تو اس سے دُور ہوتا تھا۔ اِسی مثال کو مولانا رُوم علیہ الرحمۃ نے اپنے انداز میں مثنوی شریف میں ذکر فرما کر یہ نتیجہ نکالا کہ اللہ تعالیٰ تو ہر ایک سے قریب ہے مگر وہ کوئی قسمت والا ہوتا ہے جو اُس کے قریب ہوتا ہے۔

مسئلہ قربِ خداوندی کے وضاحت کی یہاں جتنی ضرورت تھی اُس کا بیان ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ حق اور صواب پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(۳) کیا وسیلہ ماننا اور وسیلے کا پکڑنا شرعاً اور عقلاً ہم پر ضروری ہے؟

اِس بحث میں ہم یہ بیان کریں گے کہ وسیلہ کا اِنکار شرعاً اور عقلاً کسی طرح بھی درست نہیں بلکہ ضروری ہے کہ ہم اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان وسیلہ تسلیم کریں۔ بعض اوقات منکرین وسیلہ بڑے چٹخارے لے لے کر کہتے ہیں کہ دیکھو

فلاں شخص بزرگوں کا بہت ماننے والا تھا اور اُن کے مزارات پر بھی حاضری دِیا کرتا تھا لیکن آج کل اُن سے بڑا بدظن ہو گیا ہے اور وہ کہتا ہے جب میں بیمار پڑ گیا تھا تو اُن لوگوں کے وسیلے سے بڑی دُعائیں کی تھیں اور اُن کی بارگاہوں میں حاضریاں بھی بہت دی تھیں مگر حرام ہے جو ایک لمحہ کے لئے بھی سکون ملا ہو۔

اس سلسلے میں اتنا عرض ہے کہ ہم آپ کو سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لوگ ایسے دِکھا سکتے ہیں جو اس بات کا حلفیہ بیان دیں گے کہ جب بھی ہم نے صالحین کی بارگاہوں میں یا اُن کے مزارات پر حاضری دِی ہے تو ہمیشہ سکون پہنچا ہے بلکہ جب تک ہم اُن کی بارگاہ میں حاضر رہے اُس وقت تک دُنیا و مافیہا کے غم واندوہ سے اپنے آپ کو کوسوں دُور محسوس کیا ہے۔ کام کا ہونا یا نہ ہونا الگ بات ہے۔ کیونکہ کام کا حقیقتاً کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، رہے بزرگانِ دین یہ تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ ہوتے ہیں۔

اور اس بارے میں یہ بھی عرض کروں گا کہ جو لوگ بزرگانِ دِین کو اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان وسیلہ مانتے ہیں وہ جب بغیر واسطے کے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں مانگتے ہیں اور یہ طریقہ تو آپ کے نزدیک بھی بالکل صحیح اور درست ہے تو ایسی صورت میں تو اُن کی دُعائیں قبول ہو جانی چاہئیں مگر بعض اوقات جس طرح وہ چاہتے ہیں اس طرح سے دُعاؤں کی قبولیت نہیں ہوتی ہے تو اس کی کیا وجہ ہے۔ اس پر اگر یہ کہا جائے چونکہ انہوں نے ایسا طریقہ اپنا لیا ہے کہ وہ گاہ بگاہ اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان وسیلہ لاتے رہتے ہیں اور ان کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس کی ناراضگی کا سبب بنتا ہے اِس بناء پر اُن کی دُعائیں قبول نہیں ہوتی ہیں تو اس بارے میں عرض کرتا ہوں کہ اس کا مطلب تو پھر یہ ہو جانا چاہئے کہ جو لوگ وسیلے کے قائل نہیں اُن کی ہر ہر مراد اس طرح پوری ہونی چاہئے جس طرح کہ وہ چاہتے ہیں جبکہ اس طرح نہیں ہے۔

سابقہ عبارت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو حضرات وسیلے کے ذریعے دُعا کے قائل ہیں

یا اُس کے منکر، دونوں قسم کے لوگوں کی نہ تو تمام دُعائیں بعینہٖ پوری ہوتی ہیں اور نہ ہی اُن کی سب دُعائیں رد ہوتی ہیں۔

اس لئے اِس بناء پر یہ فیصلہ کرنا کہ ان میں سے فُلاں حق پر ہے اور فُلاں باطل پر، درست نہیں اور اِس سلسلے میں یہ بھی عرض ہے جہاں آپ نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ مقصد برآری اور دُعا قبول نہ ہونے کی وجہ سے وہ وسیلے کے منکر ہو گئے، وہاں ایسے لوگ بھی ضرور ملیں گے جو کہ دُعاؤں کے قبول نہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے منکر ہو گئے تو ایسی صورت میں تو اللہ تعالیٰ سے مانگنے کو بھی ناجائز قرار دینا چاہیے۔ جیسا کہ مرزا غالب اور میر تقی میر نے اپنے اپنے اشعار میں اس کا برملا اظہار کیا ہے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ (۱) کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

ایک مثال اور چند باتیں

مزید یہ کہ آپ کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جنہیں بیماری کی حالت میں ان کے گھر والے دوائی کھانے پر مجبور کرتے ہیں مگر وہ انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اس کے بغیر ہی ٹھیک ہو جائیں گے اور وہ دوائی کے قریب جانا بھی پسند نہیں کرتے جبکہ ہر آدمی یہ بات جانتا ہے کہ دوائی صحت نہیں بلکہ صحت کے لئے وسیلہ ہے مگر ایسے مریضوں کی ذہنی کیفیت ان کے تمام عزیز و اقارب اور دوستوں کے لئے پریشان کن ہوتی ہے اور ان کی اس ذہنی پستی اور مایوس کن صورتحال سے اُن کے تمام محبین عاجز نظر آتے ہیں اور مختلف حیلے اور بہانے کر کے اُنہیں دوائی اور غذا کھانے پر مجبور

---

(۱) تلک۔ وہ علامت جو ہندو لوگ اپنی اپنی قوم کے رواج کے موافق صندل وغیرہ کی لگاتے ہیں۔

کرتے رہتے ہیں۔ جس طرح اُن کی یہ کیفیت صاحب علم وشعور لوگوں کے لئے لمحہ فکریہ ہوتی ہے اور اُنہیں اس کیفیت سے باہر لانے کے لئے ہر وقت وہ کوشاں رہتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ جو لوگ عقیدہ کے تزلزل اور اس کی پستیوں کا شکار ہو کر وسیلے کا انکار کرنے لگتے ہیں اُن کا ایسا کرنا صاحب علم وفضل لوگوں کے لئے لمحہ فکریہ ہو جاتا اور وہ انہیں اس کیفیت سے باہر لانے کی کوشش کرتے، نا یہ کہ ان کے اس مرض کو بڑھانے میں ان کی ہاں میں ہاں ملائیں بلکہ انہیں تو ایسے مریضوں کے سامنے یہ کہنا چاہئے کہ ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک ذات کا وسیلہ ہے وہ اس طرح کہ فرشتہ جب قبر میں آخری سوال کرے گا اور اسی پر ہمارے جنتی اور جہنمی ہونے کا دارومدار ہے وہ سوال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معرفت اور عدم معرفت کے بارے میں ہوگا وہ اس طرح کہ فرشتہ پوچھے گا

ما کنت تقول فی ھذا الرجل؟

کہ تم اس مردِ مقدس کے بارے میں کیا کہا کرتے تھے۔ اگر جواب میں **ھاھا لا ادری** (کہ ہائے ہائے میں نہیں جانتا) کہہ کر عدم معرفت اور نہ پہچاننے کا اظہار کر دیا تو ہمیشگی کی جہنم مقدر ہو جائے گی لیکن اگر پہچان لیا تو بالآخر جنت مقدر ہوگی۔ پس اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کونسی چیز وسیلہ ہو سکتی ہے جس کی معرفت کی بناء پر انسان جنتی اور عدمِ معرفت کی بناء پر جہنمی قرار پائے۔

ایک حسین واقعہ

ایک روز کا واقعہ ہے میرے شیخ میرے مرشد حضرت امام اہلسنّت اپنی لائبریری میں جائے نماز پر جلوہ گر تھے تو میں نے اُن سے عرض کیا کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اولیائے کرام کے مزارات پر بہت حاضریاں دیں اور کہیں بھی ہماری آس بر نہ آئی اور ہماری تمنائیں پوری نہ ہوئیں، تو اس پر آپ نے جواباً ارشاد فرمایا

ہاں بیٹے! کل میرے پاس دوسرے فرقے کے چند نوجوان بچے آئے تھے اور انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم نے اپنی آرزوؤں کے پورا ہونے کے متعلق بہت دُعائیں کیں مگر کوئی تمنا بھی پوری نہ ہوئی۔ اب یہ سوچ کر آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ہیں کہ کسی اللہ والے سے دُعا کرواتے ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ اس وسیلے سے ہم پر کرم فرمادے۔

شیخ کامل کا اِتنا جواب اس احقر راقم الحروف کے سمجھانے کے لئے کافی تھا اور یہ ساری زِندگی کے لئے مشعل راہ کا کام دیتا رہے گا۔

مزید یہ کہ راقم الحروف اس بحث میں وسیلے کی تحقیق احادیثِ مبارکہ، فلسفہ قدیم اور جدید سائنس کے امتزاج سے پیش کرتا ہے جو یقیناً قارئین کرام کی دلچسپی کا باعث ہوگی۔

جب قرآن مجید میں رب العالمین نے "وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ" اِرشاد فرمادِیا ہے کہ "تم اللہ کی طرف وسیلہ پکڑو" یعنی اللہ تعالیٰ کے قرب کیلئے وسیلہ طلب کرو۔ تو اس کے بعد کسی مسلمان کے لئے یہ بات جائز نہ رہی کہ وہ وسیلہ کا اِنکار کرے۔ سردست ہم یہاں یہ بیان نہیں کر رہے کہ وسیلہ سے کیا مراد ہے کیونکہ ہر چیز کا بیان اُس کے اپنے مقام پر ہوگا کہ کون کون سی چیز اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ بن سکتی ہے۔ بس اس وقت یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ وسیلے کا مطلقاً اِنکار قرآن مجید کا اِنکار ہے جس کی بناء پر مسلمان دائرہ اِسلام سے خارج ہو جائے گا۔ یہ بات تو تھی شرع کی کہ قرآن پاک نے ہم پر لازم کر دِیا ہے کہ ہم وسیلہ پکڑیں۔

ہاں! بعض حضرات نے اِس آیت کریمہ کا ایسا مطلب لیا جس کا اِس آیت قرآنیہ سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا اور کوئی بھی عقل و خرد رکھنے والا شخص اگر انصاف سے کام لے تو وہ یہ بات کہے گا کہ قرآن پاک کی اِس آیت کا یہ مطلب کسی صورت میں نہیں بنتا۔

راقم الحروف اِس بات کی وضاحت کرتے ہوئے چند سطور تحریر کرتا ہے۔
فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ملاحظہ فرمائیے۔رَبُّ العالمین نے اِرشاد فرمایا

وَابۡتَغُوۡا اِلَيۡهِ الۡوَسِيۡلَةَ (المائدہ آیت ۳۵)

ترجمہ: ''اللہ کی طرف وسیلہ طلب کرو۔''

اگر اِس کا یہ مطلب لیا جائے کہ وسیلہ جنت کے ایک مقام کا نام ہے جس کا ذِکر اذان کے بعد کی جانے والی دُعا میں بھی آتا ہے اور اِسی بناء پر اِس دُعا کا نام دُعائے وسیلہ رکھ دیا گیا ہے۔پس ہم اِس دُعا میں اِس طرح کہتے ہیں

وَاٰتِ مُحَمَّدَ ۨالۡوَسِيۡلَةَ

ترجمہ:''(اے اللہ!) محمد عربی ﷺ کو (جنت میں) مقام وسیلہ عطا فرما۔''

لہٰذا مذکورہ بالا آیت میں بھی کسی کو وسیلہ بنانا مراد نہیں بلکہ یہاں بھی مقام وسیلہ کا ذکر ہے جیسا کہ اذان کے بعد کی دُعا میں آیا ہے۔

پس آپ غور فرمائیے، یہ بات کتنی نامعقول ہے کیونکہ آیت کریمہ میں جو الوسیلۃ ہے اگر اِس سے مراد جنت کا عظیم مقام ہو، تب کیا آپ وَابۡتَغُوۡا اِلَيۡهِ الۡوَسِيۡلَةَ کا ترجمہ اِس طرح کریں گے کہ تم اللہ کی طرف مقام وسیلہ جو جنت کا عظیم درجہ ہے اُسے پکڑو۔یہ ایک ناسمجھ آنے والا مفہوم ہے۔

ہاں! اگر یہ کہا جائے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنی عبادت و ریاضت کرو کہ مقام وسیلہ کو پالو تو واضح رہے کہ اس مفہوم کے مراد لینے میں تو ہمارا دوغلا پن اور قرآن وحدیث کا تضاد ظاہر ہوگا کیونکہ ہم اذان کے بعد تو اللہ تعالیٰ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے جنت کے عظیم مقام وسیلہ کا سوال کرتے ہیں لیکن اُس کے بعد پھر ہم خود اُسی مقام کے متمنی ہو جائیں جبکہ یہ وہ مقام ہے جس کے بارے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اِرشاد فرمایا، یہ مقام صرف ایک شخص کو دِیا جائے گا اور اُمید کرتا ہوں کہ ''وہ

میں ہوں''۔

واضح رہے کہ نبی کی اُمید یقین ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نبی کے دِل کو کسی باطل چیز کے ساتھ متعلق اور معلق نہیں فرماتا ہے۔

ذرا آپ سوچئے تو سہی کہ ایک چیز جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خاصہ ہو، کیا ہم اُمتیوں کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ ہم اُس کے اُمیدوار یا متمنی ہو جائیں بلکہ ہمارا منصب تو یہ ہے کہ ہم اپنے نبی کا عروج دیکھ دیکھ کر خوش ہوں اور سر نیاز جھکاتے ہوئے خدا کا شکر ادا کریں اور بارگاہِ ایزدی میں شکرانے کے سجدے کرتے ہوئے عرض کریں کہ اے پروردگار! تیرا ہم پر احسان ہے کہ تو نے ہمیں ایسے عظیم نبی کا اُمتی بنایا، جس کی ایسی بلندو بالا شان بنائی ہے۔

حدیث پاک ملاحظہ فرمائیے

عن عبد اللّٰہ بن عمرو بن العاص انه سمع النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل مایقول ثم صلوا علیّ فانه من صلّٰی علیّ صلٰوة صلّٰی اللّٰہ علیه بها عشرا ثم سلوا اللّٰہ لی الوسیلة فانها منزلة فی الجنة لا تنبغی الا لعبد من عباد اللّٰہ وارجوان اکون انا هو فمن سأل لی الوسیلة حلّت علیه الشفاعة.

(مسلم شریف ج ۱، ص ۱۶۶، قدیمی کتب خانہ کراچی)

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ﷛ سے روایت ہے کہ اُنہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم مؤذن کی اذان سنو تو کلماتِ اذان کو اُسی طرح دہراؤ پھر اذان کے بعد مجھ پر درود بھیجو کیونکہ جو مجھ پر ایک دفعہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اُس پر اُس کے بدلے میں دَس رحمتیں نازِل فرماتا ہے پھر اللہ تعالیٰ سے میرے لئے وسیلہ کی دُعا کرو، وہ جنت میں ایک عظیم مقام ہے۔ وہ مقام اللہ تعالیٰ کے بندوں میں

سے صرف ایک بندے کو ملے گا اور اُمید کرتا ہوں کہ وہ میں ہوں۔ پس جس نے میرے لئے مقام وسیلہ کا سوال کیا اُس کیلئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔''

ہماری سابقہ عبارت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آیت کریمہ میں **الوسیلۃ** سے مراد مقام وسیلہ نہیں بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف بعض چیزوں کو وسیلہ بنانے کا ذِکر ہے۔

واضح رہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے مقام وسیلہ کی دُعا کرنا اس لئے نہیں کہ ہم گناہ گاروں کی دُعا کی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ مقام مل جائے گا بلکہ اِس لئے ہے کہ جب ہم یہ دُعا کریں گے تو آپ ﷺ کی شفاعت کے مستحق قرار پائیں گے۔

عقلی دلائل

اب ہم عقلی طور پر یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ وسیلے کے بغیر ہمارا چارہ نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ دُنیاوی امور میں وسیلہ تلاش کرنا اِنسان کی جبلت اور فطرت میں داخل ہے۔ جیسا کہ نومولود بچہ جو کہ ابھی تک سمجھ بوجھ اور بولنے کے قابل نہیں ہوتا۔ ماں کا دُودھ حاصل کرنے کے لئے رونے اور چلّانے کو وسیلہ بنالیتا ہے۔

جب ہم اِس دُنیا میں غور کرتے ہیں تو یہ بات یقیناً قابل توجہ ہے کہ ہمیں کوئی ایک تنکا بھی ایسا دِکھائی نہیں دیتا جو وسیلے کے بغیر ہو مثلاً تنکا کسی درخت وغیرہ کا ہوگا اور وہ درخت زمین میں اُگا ہے یعنی یہ زمین اُس کے وجود کے لئے وسیلہ ہوئی اور لازماً اسے پانی بھی ملا ہوگا اور وہ پانی اُس کی پرورش کے لئے وسیلہ ہوا اور اُس کا بیج جس سے وہ اُگا ہے یقیناً وہ اُس جیسے کسی دُوسرے درخت سے حاصل ہوا ہوگا تو وہ درخت اس دُوسرے درخت کے لئے اصل قرار پائے گا اور اِسی طرح ہر بکری کسی نہ کسی بکری اور بکرے کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس بکری نے اپنی ماں کا دُودھ پیا جس کی بناء

پر اس کی پرورش ہوئی اور کچھ عرصے کے بعد اُس نے گھاس پھوس کھایا، اِس بناء پر وہ جوان ہوئی پھر اُس کی اولاد ہوئی اور اس گھاس پھوس کی بناء پر اُس کے تھنوں میں دودھ اُترا، جو اُس کی اولاد نے پیا۔ اِسی طرح پھر اُن کی پرورش ہوئی۔

الغرض یہ کہ اِس کائنات میں ہر چیز کا وجود لازماً کسی نہ کسی دُوسری شے کا مرہونِ منت ہے۔ اِس بات کو تسلیم کرنے اور جان لینے کے بعد کہ یہ سب کچھ اِنتہائی تنظیم اور ترتیب کے ساتھ ہو رہا ہے لازماً یہ بات ماننی پڑے گی کہ اِن تمام معاملات کے پیچھے کوئی بہت عظیم طاقت اور اِنتہائی پُرحکمت ذات کارفرما ہے، جو یہ سب کچھ کر رہی ہے۔

ابھی ہم نے عرض کیا کہ ہر چیز کسی نہ کسی دُوسری چیز کی مرہونِ منت ہے۔ اِس سے یہ بات نہ سمجھ لی جائے کہ یہ لامتناہی سلسلہ ہے جو کہ ہمیشہ سے چل رہا ہے۔ واضح رہے اِسے منطقی اور فلسفی اپنی اصطلاح میں تسلسل کہتے ہیں جبکہ اسے محال اور ناممکن قرار دِیا گیا ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جسے ثابت کرنے کے لئے اُن فلاسفہ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جو اِس کائنات کو قدیم یعنی ہمیشہ سے مانتے ہیں کیونکہ اگر وہ یہ ثابت کر دیں کہ کائنات میں تسلسل ہے اور یہ سلسلہ کہیں رُکنے والا نہیں ہے تب تو اِس کائنات کا ہمیشہ سے ہونا تسلیم کرنا پڑے گا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار لازم آئے گا۔ وہ اس طرح کہ جب اس کائنات میں ہم تسلسل کو مان لیں گے تو یہ بات ماننی پڑ جائے گی کہ معاملاتِ کائنات رُکنے والے نہیں ہیں تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کو خالقِ کائنات کیسے قرار دِیا جا سکے گا۔ یعنی یہ معاملہ کہیں رُکے، تب تو ہم کہیں کہ یہ اُس کی انتہا ہے اور یہیں سے اُس کی ابتداء ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ اس کا خالق ہے اور پھر اُس کے بنائے ہوئے طریقے کے مطابق یہ سلسلہ شروع ہوا اور پھر وہ اپنی قدرت اور قوت کے ذریعے سے ان کی تربیت فرماتا رہا۔ یہاں تک کہ اُس نے ان اشیاء کو ان کے کمال عروج تک پہنچا دِیا یعنی کائنات کے تسلسل کے نظریہ سے

اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار لازم آتا ہے۔

گزشتہ عبارت کا مفہوم بالفاظ دیگر ملاحظہ فرمائیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں یہ بات ناممکن اور محال تھی کہ وہ کائنات کی اِبتدائی گہرائیوں کو چھوسکیں اور نہ اس وقت ایسے آلات تھے جن کے ذریعے اِس کی تحقیق کی جاسکتی تھی۔ تب اُنہوں نے کائنات کے لامتناہی ہونے کو ثابت کرنے کے لئے ایک ایسا قانون بنایا جسے تمام نام نہاد عُقلاء نے تسلیم کیا۔ وہ قانون یہ تھا کہ جس چیز کی کوئی اِنتہا نہیں، اُس کی اِبتداء بھی نہیں اور جس کی اِنتہا ہے اُس کی ابتداء بھی ہے اور اُنہوں نے اِس مسئلے کا نام جزء لا یتجزیٰ کا بطلان رکھا یعنی کائنات میں کوئی ایک جزء بھی ایسا نہیں کہ جس کا آگے جزء نہ ہوسکے۔ اگرچہ کہ عملی طور پر ہم اُس کے حصے نہ کرسکیں لیکن عقل اس بات کو جائز رکھے گی کہ اُس جزء کے اجزاء ہو جائیں اور اسی طرح اُن اجزاء کے اجزاء ہوتے چلے جائیں یعنی یہ چیز کہیں پر رُکنے والی نہیں۔ پس جب کائنات میں کسی ایک ذرے کی بھی اِنتہا نہیں تب لازماً یہ بات ماننی پڑے گی کہ اِس کائنات کی اِبتداء بھی نہیں اور جب کائنات کی کوئی اِبتداء ہی نہ رہی تب اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرنا کہ وہ اِس کائنات کا خالق و مالک ہے اور اِس میں سب کچھ اُس کے اِختیار سے ہے بالکل بے معنیٰ اور لغو ہو کر رہ جائے گا کیونکہ کائنات اپنے وجود میں اپنے قدیم اور ہمیشہ سے ہونے کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے وجود کی محتاج نہ رہی، برخلاف دُوسرے گروہ کے، جو اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں وہ کائنات کے ذرات اور اجزاء کے متعلق یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان کی ایک انتہا ہے یعنی جزء لا یتجزیٰ ثابت ہے کہ ایک آخری جزء ایسا ہوگا کہ اگر ہم نے اس کو تقسیم کیا تو پھر اس کا آگے جزء نہ ہوگا کیونکہ وہ آخری جزء ہے۔

یعنی یہ بات لازمی ہے کہ اِس کائنات کے اجزاء ایک ایسے مقام پر آ کر ٹھہر

جائیں کہ جہاں پر اُن کے آگے اجزاء نہ ہو سکیں یعنی اِس کائنات کی ایک اِنتہا ثابت ہو جائے، جب اِنتہا پائی جائے گی تب لازماً اِس کی اِبتداء بھی پائی جانی چاہئے اور اِس صورت میں ان کا کوئی نہ کوئی خالق بھی ماننا پڑے گا۔ ایسی صورت میں یہ کائنات قدیم نہ رہے گی بلکہ حادث و ناپید شمار کی جائے گی اور اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کو اس کائنات کا خالق تسلیم کرلیا جائے گا۔ یہ تو تھا فلسفۂ قدیم۔

اب ہم ایک خاص ترتیب سے قدیم فلسفہ، صوفیاء کا قول اور چند سائنسی مسلّمات پیش کرنے کے بعد احادیثِ مبارکہ کے ذریعے سے ایک خاص نتیجہ نکالتے ہیں اور اِس کائنات کی ابتداء کا کھوج لگاتے ہیں۔ متوجہ ہوں۔

پہلی بات:- قدیم فلسفہ کا یہ اصول ہے کہ جو اِنتہا ہے وہی اِبتداء ہے۔ اِسی اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُنہوں نے اِس کائنات کو قدیم ثابت کرنے کے لئے جزء لا یتجزیٰ کو تسلیم نہیں کیا ہے یعنی ان کے نزدیک یہ ممکن نہیں کہ کوئی ایسا جزء پایا جاسکے جو کہ تقسیم نہ ہو سکے۔

دُوسری بات:- صوفیائے کرام کا قول ہے **النهاية هو الرجوع الى البداية** ''نہایت اصل میں وہی اِبتداء کی طرف لوٹنا ہے'' یعنی ہر شے کی اِنتہا اُس کی اِبتداء کا راستہ دِکھاتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اُس کی اِبتداء تک پہنچا دیتی ہے۔ اس پر میرے شیخ میرے مرشد حضرت امام اہلسنّت یہ مثال دِیا کرتے تھے کہ آپ ایک آم کی گٹھلی زمین میں بوئیں، چند روز بعد آم کا پودا نمودار ہو گا۔ چند برس میں وہ تن آور درخت بنے گا پھر اُس میں آم لگیں گے۔ پھر جب وہ پک کر تیار ہو جائیں تو آپ ایک آم کو توڑ کر اُس کا گودا چوس لیں۔ چھلکا پھینک دیں، آخر میں گٹھلی آپ کے ہاتھ میں موجود ہو گی جو زبانِ حال سے بتلا رہی ہو گی کہ میری اِبتداء بھی گٹھلی سے ہوئی تھی۔

تیسری بات:- سائنس اِس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ نور یعنی روشنی مادے میں

تبدیل ہو جاتی ہے اور روشنی میں جو ذرات پائے جاتے ہیں اُن کو فوٹون کہتے ہیں۔

چوتھی بات:- کسی بھی چیز کا آخری ذرہ، ایٹم کہلاتا ہے اور جب اُس ایٹم کو توڑا جاتا ہے تب وہ قوت، طاقت، توانائی اور نور میں بدل جاتا ہے اور یہی حقیقت ہے ایٹم بم کی کہ جب آخری ذرہ یعنی ایٹم کو توڑا جاتا ہے تو وہ انتہائی قوت و طاقت میں بدل جاتا ہے اور اسی بناء پر وہ بے پناہ تباہی پھیلاتا ہے۔

پانچویں بات:- فرانس میں ہونے والی (Cosmologist) ماہرین علم کائنات کی ایک میٹنگ ہوئی جس کی روئیداد امریکہ سے 1984ء میں چھپنے والے ایک سائنسی تحقیقی میگزین Discover میں شائع ہوئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان حضرات نے اس کائنات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ بات کہی کہ اب ہم اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اِس کائنات سے پہلے کچھ بھی نہیں تھا۔ اچانک ایک نوری نقطہ ظاہر ہوا جس کی روشنی کی شدت اور قوت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پھر اس سے مختلف ذرات ظاہر ہوئے اور پھر انہی ذرات کی مختلف تراکیب کی بناء پر یہ کائنات بنتی چلی گئی یعنی ان حضرات نے اپنی بگ بینگ کی پہلی تھیوری جو بیان کی جاتی رہی ہے اس کو غلط قرار دے دیا۔

اب مذکورہ بالا نظریات اور تجربات کا خلاصہ ایک ترتیب سے پیش کرتے ہیں تا کہ ہم کائنات کی حقیقت کو پا سکیں۔ ملاحظہ فرمائیے

صوفیاء اور فلاسفہ کے نظریات کا خلاصہ یہی بنتا ہے جو کسی شے کی اِنتہا ہے وہی اُس کی اِبتداء ہے۔ فرق دونوں میں صرف اِتنا ہے کہ صوفیاء اِنتہا کے قائل ہیں اِس لئے اِبتداء کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر بعض فلاسفہ اِنتہا کے قائل نہیں اِس بناء پر اِبتداء کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ ہاں، اگر اُن کے نزدیک اِنتہا ثابت کر دی جائے تو وہ بھی اِس بات کو ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ہاں یہی اِس کی اِبتداء ہے۔ کیونکہ ان کا نظریہ یہی ہے کہ جو انتہا ہے وہی ابتداء ہے۔

مزید یہ کہ آج کل کے سائنس دانوں نے ایٹم بم بنا کر یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہر شے کی اِنتہا قوت، طاقت اور نور ہے۔ اور یہ بات فلاسفہ اور صوفیاء کے مابین مسلم رہی ہے کہ جو انتہاء ہے وہی ابتداء ہے۔ چونکہ ہر شے کی انتہاء قوت، طاقت اور نور ہے پس ثابت ہوا کہ ہر شے کی ابتداء بھی قوت، طاقت اور نور ہی ہے۔ اور اس بات کا برملا اظہار Discover رسالہ میں کیا گیا ہے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اور سائنس یہ بات تسلیم کر چکی ہے کہ نور یعنی روشنی مادے میں بدل جاتی ہے۔ اب ہم یہ بات ماننے پر مجبور ہو گئے کہ کائنات کی اِبتداء نور، روشنی اور بے پناہ طاقت وقوت سے ہوئی ہے۔

اِس تمام تر تحقیق کے بعد ہم دَرِ مصطفٰی کو کھٹکھٹاتے ہیں اور عرض کرتے ہیں، یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم آپ ہمیں اس گرداب سے نکالیئے اور بتایئے یہ کائنات کس طرح معرضِ وجود میں آئی۔ تو لیجئے، پڑھئے حضور پُر نور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی حدیث پاک ہے

عن جابر بن عبد اللّٰہ الانصاری رضی اللّٰہ تعالٰی عنهما قال قلت یا رسول اللّٰہ بابی انت و اُمی اخبرنی عن اول شیء خلقه اللّٰہ قبل الاشیاء قال یا جابر ان اللّٰہ خلق قبل الاشیاء نور نبیک محمد صلی اللّٰہ علیه وسلم من نوره فجعل ذٰلک النور یدور بالقدرة حیث شاء اللّٰہ ولم یکن فی ذٰلک الوقت لوح ولا قلم ولا جنة ولا نار ولا ملک ولا سماء ولا ارض ولا شمس ولا قمر ولا انس ولا جن فلما اراد اللّٰہ تعالٰی ان یخلق الخلق قسم ذٰلک النور أربعة اجزاء فخلق من الجزء الاوّل القلم ومن الثانی اللوح ومن الثالث العرش ثم قسم الجزء الرابع اربعة اجزاء فخلق من الاوّل حملة العرش ومن الثانی

الكرسی ومن الثالث باقی الملائکة ثم قسم الرابع اربعة اجزاء فخلق من الاوّل السمٰوٰت ومن الثانی الارضین ومن الثالث الجنة والنار ثم قسم الرابع اربعة اجزاء فخلق من الاوّل نور ابصار المؤمنین ومن الثانی نور قلوبهم وهی المعرفة باللّٰه ومن الثالث نور انسهم وهو التوحید لا اِله الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم.

حضرت امام عبدالرزاق صاحبِ مصنَّف نے اپنی سند کے ساتھ سیدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت جابر فرماتے ہیں، میں نے عرض کیا، ''یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ مجھے خبر دیں کہ وہ پہلی چیز کون سی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے پیدا فرمایا؟'' حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اِرشاد فرمایا، ''اے جابر! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے پہلے آپ کے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا فرمایا۔ پھر یہ نور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے موافق جہاں اس نے چاہا سیر کرتا رہا۔ اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم، نہ جنت تھی نہ دوزخ، نہ فرشتہ تھا نہ آسمان نہ زمین تھی، نہ سورج نہ چاند، نہ جن نہ اِنسان جب اللہ تعالیٰ نے اِرادہ فرمایا کہ مخلوقات کو پیدا کرے تو اس نور کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلے حصے سے قلم بنایا، دُوسرے حصے سے لوح، تیسرے حصے سے عرش اور پھر چوتھے حصے کو چار حصوں میں تقسیم کیا تو پہلے حصے سے عرش اُٹھانے والے فرشتے بنائے اور دُوسرے سے کرسی اور تیسرے سے باقی فرشتے اور پھر چوتھے حصے کو چار حصوں میں تقسیم کیا تو پہلے حصے سے آسمان بنائے اور دُوسرے سے زمین اور تیسرے سے جنت اور دوزخ اور پھر چوتھے حصے کو چار حصوں میں تقسیم کیا تو پہلے سے مومنین کی آنکھوں کا نور بنایا اور دُوسرے سے ان کے دِلوں کا نور پیدا کیا جو معرفت اِلٰہی ہے اور تیسرے سے ان کا نور انس پیدا کیا اور وہ توحید ہے جس کا خلاصہ ہے **لا الٰہ الا اللّٰہ محمد**

رسول اللّٰہ الخ. (مقالاتِ کاظمی ج۱،ص۶۰ ،بحوالہ مواھب اللدنیہ ج۱،ص۹،سیرت حلبیہ،ج۱،ص۳۰ ،زرقانی ج۱،ص۴۶،الفتاوی الحدیثیۃ ص ۴۴)

دُوسری روایت میں اس طرح سے ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اِرشادفرمایا اوّل ما خلق اللّٰہ نوری کہ ’’اللہ نے سب سے پہلے میرے نورکو پیدا فرمایا۔‘‘ اب وہ حدیث پیش کی جاتی ہے جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نوری ستارے کی صورت میں موجود ہونے کاواضح بیان ہے۔

وعن ابی ھریرۃ أنہ علیہ السلام سأل جبریل علیہ السلام فقال: ’’یا جبریل کم عمرک من السنین‘‘ فقال یا رسول اللّٰہ لست أعلم غیر أنَّ فی الحجاب الرابع نجمًا یطلع فی کل سبعین ألف سنۃ مرۃ رأیتہ اثنین وسبعین الف مرۃ فقال علیہ السلام: ’’یا جبریل وعزۃ ربی أنا ذٰلک الکوکب.‘‘ (تفسیر روح البیان،ج۳،ص۶۸۹)

ترجمہ: ’’حضرت ابو ہریرہ ﷜ سے روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جبریل امین سے سوال کیا کہ آپ کی عمر کتنے سال ہے؟ پس اُنہوں نے عرض کیا، میں تو صرف اِتنا ہی جانتا ہوں کہ چوتھے حجاب عظمت میں ہر ستر ہزار برس بعد ایک ستارہ چمکتا تھا جسے میں نے بہتر ہزار مرتبہ دیکھا ہے۔ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اِرشادفرمایا، اے جبریل، مجھے میرے رب کی عزت کی قسم! میں ہی وہ ستارہ ہوں۔‘‘

اِن حدیثوں سے ہم پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اِس کائنات کی اصل اور اِس کائنات کی حقیقت نورِ محمدی ہے اور یہی بات ہمارے علماء اور صوفیاء کہتے چلے آئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جامع الحقائق اور اصل کائنات ہیں۔ یہ جملے جب ہمارے علماء بولا کرتے تھے تو چند نادان لوگ اِن جملوں کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ مگر اِس مذکورہ بالا تحقیق کے بعد ان جملوں کی حقانیت کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ اور مزید یہ

بات بھی واضح رہے کہ جس کی بناء پر کسی چیز کا وجود بنے وہ شے دوسرے کے وجود کے لئے اصل، وسیلہ اور ذریعہ قرار پاتی ہے۔ پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اِس کائنات کے ذرے ذرے کے لئے اصل قرار پائے اِس لئے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تمام کائنات کے لئے وسیلہ ہیں۔

سینکڑوں سال پہلے کا قول صوفیاء اور آج کا Discover رسالہ

ہمارے بعض صوفیاء سے ایسی روایات بھی ملتی ہیں جو Discover رسالے میں شائع ہونے والی تحقیق کے بہت قریب ہیں۔ وہ یہ کہ صوفیا نے آج سے سینکڑوں سال پہلے یہ بات فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نور پاک کو ظاہر فرمایا تو حقیقت محمدیہ نورانیت سے جو تجلیات جھڑیں اور ظاہر ہوئیں اُن سے یہ کائنات بنتی چلی گئی۔

ہمیں اس بات سے قطعاً کوئی غرض نہیں کہ سائنسدانوں کے نظریات بگ بینگ تھیوری کی تائید میں ہوں یا رد میں۔ بہرحال یہ بات ان کے نزدیک پایۂ ثبوت کو پہنچ رہی ہے کہ یہ کائنات دراصل نوری کرنوں اور شعاعوں کے باہمی کھیل کا نتیجہ ہے اور آج کل کے فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر زیرِ زمین ستائیس کلومیٹر لمبی سرنگ میں ہونے والے تجربہ سے بھی یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہاں! اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جامع الحقائق ہیں اور ہر شے کی حقیقت کا ظہور ایک ذات سرکارِ مدینہ ﷺ سے ہوا ہے اور سرکارِ دوعالم ﷺ اصلِ کائنات ہیں تو اِس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ جب اِس کا ظہور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ بابرکات سے ہوا ہے اور اِس کائنات میں تو غلاظتیں اور برائیاں بھی پائی جاتی ہیں تو کیا یہ سب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اندر موجود تھیں۔ العیاذ باللہ۔

اِس بارے میں اِتنا عرض ہے کہ شے جب تک اپنی اصل اور حقیقت پر برقرار رہتی ہے تو اِس پر خارج کے اعتبار سے برائی اور غلاظت کا حکم نہیں لگتا ہے۔ جیسا کہ انڈے سے نکلنے والے نومولود مرغی کے چوزے کی بناء پر انڈے کو حرام قرار نہیں دِیا جا سکتا ہے یعنی یوں نہیں کہا جائے گا کہ چونکہ انڈے کی زردی اور سپیدی سے ہی وہ چوزہ بنا ہے اور اس کے پر جن کا کھانا درست نہیں اور خون جس کا کھانا یا پینا یقیناً حرام ہے اور یہ ناپاک ہے، اِس بناء پر یہ انڈا ناپاک اور حرام ہے'' یہ کہنا اس لئے درست نہیں کہ شے جب تک اپنی حقیقت میں ہوتی ہے اُس پر خارج کے لحاظ سے حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ یہ تمام کائنات جب تک حقیقتِ محمدیہ سے جدا نہ ہوئی تھی اور اس کا وجود خارجی نہ بنا تھا اس پر خارج کے لحاظ سے حکم لگانا درست نہیں ہے۔

اب ہم مزید ایسی احادیث قدسیہ پیش کرتے ہیں جو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اوّلِ خلق ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

علامہ فاسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

وفی حدیث عمر بن الخطاب ﷺ عند البیهقی فی دلائله والحاکم وصححه وقول الله تبارک وتعالیٰ لادم علیه السلام لولا محمد ماخلقتک وروی فی حدیث اخر لولاه ماخلقتک ولاخلقت سماء ولا ارضا (مطالع المسرات شرح دلائل الخیرات ص ۲۶۴)

بیہقی اور حاکم نے حدیثِ عمر میں ذِکر کیا اور اس کو صحیح قرار دیا اور وہ اللہ عزوجل کا حضرت آدم علیہ السلام سے یہ فرمانا ہے کہ اگر محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا نہ کرتا اور ایک دوسری حدیث میں ہے اگر محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں نہ تم کو پیدا کرتا اور نہ ہی آسمان وزمین کو پیدا کرتا۔

اور اِسی طرح ایک دوسری حدیث ہے

لولاک لما خلقت الدّنیا

ترجمہ: ''اگر آپ نہ ہوتے تو دُنیا کو پیدا نہ فرماتا''

یہ اور ان جیسی دیگر احادیث پر چند نابلد لوگوں نے ایسے اعتراضات کئے جن کی کوئی حقیقت نہیں جبکہ ان کے بھرپور جوابات ہمارے علماء نے اپنی کتابوں میں تحریر فرمادیئے ہیں اور ان کی طرف توجہ کرنا اس وقت کوئی خاص ضروری بھی نہیں کیونکہ آج کل کے بعض سائنس داں گرچہ کہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں، اُنہوں نے بھی اپنے تجربات سے بالآخر نتیجہ وہی نکالا ہے جن کا ذکر ہماری پیش کردہ ان حدیثوں میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے چونکہ سابقہ زمانے میں یہ سائنسی تحقیق اس انداز پر سامنے نہیں آئی تھی اِس لئے ہمارا ان لوگوں کو یہ سمجھانا کہ حقیقت محمدیہ اصل کائنات ہے بڑا مشکل تھا اور تب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم یہ کہہ دیں کہ اِن حدیثوں پر اِیمان لانا ایمان بالغیب ہے اور ہم ایمان بالغیب لے کر آئے۔ مگر اب جبکہ موجودہ سائنس اپنے بارہا کے تجربات کے ساتھ اِن باتوں کو تسلیم کر چکی ہے اِس لئے عشق مصطفیٰ کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ایسی حدیثوں کی صحت اور ضعف کی ٹوہ میں نہ لگے رہیں بلکہ انہیں تسلیم کر کے عاشق مصطفیٰ ہونے کا ثبوت دیں اور گستاخیِ سرکارِ مدینہ سے بچیں۔ اب ایسی تمام تر تحقیق کے بعد بھی خوامخواہ کی باتیں بنانا اعتراض برائے اعتراض کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا جسے دوسرے الفاظ میں کج بحثی کہتے ہیں۔

اب ہم ایسی حدیث پیش کرتے ہیں کہ اسے جب سابقہ احادیث کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو واضح طور پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اوّل خلق ہونا معلوم ہو جائے گا۔ ملاحظہ فرمائیے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اِرشاد فرمایا

کنت نبیا و آدم بین الروح والجسد۔ (مشکوٰۃ: ص ۵۱۲)

ترجمہ: ''میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم علیہ السلام رُوح اور جسم کے درمیان تھے۔''

مذکورہ بالا حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس وقت بھی نبی تھے جبکہ آدم علیہ السلام کی تخلیق نہ ہوئی تھی۔ اس پر یہ لایعنی سا اعتراض کر دینا کہ اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام، اللہ تعالیٰ کے علم میں نبی تھے۔

اِس بارے میں اِتنا عرض ہے کہ میرے مرشد حضرت غزالیٔ زماں کے سامنے جب یہ بات کہی گئی تو ان کے چہرے سے یہ بات عیاں ہوتی تھی کہ انہیں اس بات سے بڑی تکلیف پہنچی ہے۔ اس پر انہوں نے فی البدیہہ اِرشاد فرمایا کہ کیا اُس وقت صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی اللہ تعالیٰ کے علم میں نبی تھے؟ اور باقی انبیاء علیہم السلام کی نبوت سے اللہ تعالیٰ لاعلم تھا؟ (معاذ اللہ) ظاہر ہے اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے تمام انبیاء کی نبوت سے واقف اور آگاہ ہے۔ اِس لئے یہ کہنا کہ مذکورہ بالا حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام محض اللہ تعالیٰ کے علم میں نبی تھے، غلط ہے۔ بلکہ اِس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ اوّلیت کا بیان ہے کہ آپ کی حقیقت مبارکہ جسے صوفیاء اور اہلسنّت کے علماء حقیقتِ محمدیہ ''نورانیت'' سے تعبیر کرتے ہیں وہ اس وقت بھی موجود تھی جبکہ آدم علیہ السلام کی تخلیق نہ ہوئی تھی۔

(۴) کیا محض اعمالِ صالحہ ہی وسیلہ ہیں یا فرشتے، مقدس اِنسان اور ان کے علاوہ دیگر تبرکات کو بھی وسیلہ بنایا جاسکتا ہے؟

اعمالِ صالحہ کو وسیلہ بنانے میں مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں یعنی جو شخص بھی نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے یا صدقہ کرتا ہے تو اُس کا ایسا کرنا اِس اُمید پر ہوتا ہے کہ نا معلوم اس میں سے اللہ تعالیٰ کس چیز کو شرفِ قبولیت عطا فرمادے اور میں اس کے وسیلے سے جنت میں داخل ہو جاؤں۔ وسیلے کی یہ صورت ایسی ہے جس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں اور اس کے قرآن وحدیث میں بے شمار دلائل موجود ہیں۔ مگر یہاں صرف ایک آیت کریمہ اور

ایک حدیث پاک پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں کہ سیدنا نوح علیہ السلام نے رب العالمین کی بارگاہ میں جب اپنے اِبن کے متعلق عرض کیا کہ اے پروردگار! تو اسے غرق ہونے سے بچالے تو پروردگار نے اِرشاد فرمایا

اِنَّہٗ لَیۡسَ مِنۡ اَھۡلِکَ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ (ھود. ۴۶)

''وہ آپ کے اہل سے نہیں رہا۔ بیشک اس کے کام برے ہیں۔''

یعنی ''اگر اس کا عمل صالح ہوتا تو وہ بچ جاتا۔''

پس ثابت ہوا اعمال ذریعہ نجات ہیں اور اس بات کی دلیل بخاری شریف کی وہ مشہور حدیث ہے جس میں تین دوستوں کا غار میں بند ہو جانے کے بعد اپنے اپنے اعمال صالحہ کا وسیلہ دے کر نجات پانے کا ذِکر ہے۔ حدیث پاک ملاحظہ ہو

حدیث غار

حضرت نافع نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، تم سے پہلی اُمت کے تین افراد کا واقعہ ہے کہ وہ چل رہے تھے۔ اچانک اُن پر بارش آ گئی اور اُنہوں نے ایک غار میں پناہ لی (تو اس اثناء میں ایک بہت بڑا پتھر غار کے دہانے پر آ گرا) اور غار کا دہانہ بند ہو گیا۔ اُنہوں نے ایک دُوسرے سے کہا، خدا کی قسم، اے دوستو! تمہیں سچائی کے سوا کوئی شے نجات نہیں دِلا سکتی۔ تم میں سے ہر ایک کو چاہئے کہ اس شے کے وسیلہ سے دُعا کرے جسے وہ جانتا ہو کہ اُس کے بیان کرنے میں وہ سچا ہے۔ پس ان میں سے ایک نے کہا، اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میرا ایک مزدور تھا جس نے ایک فِرَق (غلہ ناپنے کا ایک پیمانہ ہے) چاول کے عوض میرا کام کیا اور اُجرت چھوڑ کر چلا گیا۔ پس میں نے اس فِرَق کو لے کر زراعت کی تو اس کا نفع اِتنا ہو گیا کہ میں نے اس سے ایک گائے خرید کی۔ پھر وہ میرے پاس آیا اور اپنی مزدوری طلب کی تو میں نے اُسے کہا کہ وہ گائے ہانک کر لے

جاؤ۔اس نے مجھے کہاتمہارے پاس میری اُجرت صرف ایک فرَق چاول ہیں۔ میں نے اُسے کہاوہ گائے ہانک کر لے جاؤ، وہ اسی فرَق سے خریدی ہے۔تو وہ گائے ہانک کر لے گیا۔اے اللہ!اگرتو جانتا ہے کہ میں نے یہ عمل تیرے ڈر سے کیا تھاتو ہم سے یہ پتھر ہٹادے چنانچہ پتھر کچھ ہٹ گیا۔پھر دُوسرے شخص نے کہا،اے اللہ!تو جانتا ہے کہ میرے ماں باپ بوڑھے تھے اور میں ہر رات ان کے لئے اپنی بکریوں کا دُودھ لے جاتا تھا۔ایک رات مجھے کچھ دیر ہوگئی۔ میں آیا تو وہ سور ہے تھے اور میری بیوی اور بچے بھوک کی وجہ سے بلکتے رہے لیکن میں نے انہیں دُودھ نہ پلایا کیونکہ جب تک میرے ماں باپ دُودھ نہ پی لیتے تھے میں اُنہیں دُودھ نہ پلاتا تھا اور میں نے اُن کو بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا اور یہ بھی پسند نہ کیا کہ انہیں چھوڑ دوں کہ کہیں وہ اس کے نہ پینے کی وجہ سے کمزور ہو جائیں۔اس لئے میں اِنتظار کرتا رہا،حتیٰ کہ فجر طلوع ہوگئی۔ پس اگر میں نے یہ تیرے ڈر سے کیا ہے تو ہم سے پتھر ہٹادے۔لہٰذا ان سے پتھر کچھ اور ہٹ گیا اور اُنہوں نے آسمان دیکھ لیا۔پھر آخری شخص نے کہا،اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میرے چچا کی بیٹی مجھے سب لوگوں سے زِیادہ محبوب تھی۔ میں نے اس کو ورغلانا چاہاتو اُس نے اِنکار کردیا مگر وہ (معاشی مجبوری میں) اس پر راضی ہوگئی کہ میں اسے سو دینار دُوں۔ میں نے دینار تلاش کیئے، یہاں تک کہ وہ میں نے حاصل کر لئے تو میں وہ لے کر اُس کے پاس آیا اور اُس کے حوالے کیئے تو اُس نے مجھے اپنی جان پر قادر کر دِیا۔ جب میں اُس کے دونوں پاؤں کے درمیان بیٹھ گیا تو اُس نے کہا، اللہ سے ڈر اور مُہر کو ناحق نہ توڑ تو میں اُٹھ کھڑا ہوا اور سو دینار بھی چھوڑ دیئے۔(اے اللہ!) اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ تیرے خوف سے کیا تھا تو ہم سے یہ پتھر ہٹادے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے پتھر ہٹادِیا اور وہ باہر نکل آئے۔

(بخاری شریف، ج۱،ص ۴۹۳)

مقدس حضرات اور اُن کے تبرکات کو وسیلہ بنانے کا بیان

مقدس حضرات کو اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ بنانے کے تین مفہوم ہو سکتے ہیں۔

مفہوم نمبر ۱: وسیلہ کو مستعانِ حقیقی جانا جائے۔ اس کی دو شقیں ہیں

شق نمبر ۱: یہ اعتقاد رکھنا کہ اللہ چاہے یا نہ چاہے یہ حضرات ہمارا کام کر دیں گے۔

شق نمبر ۲: یہ حضرات اللہ تعالیٰ سے زبردستی کام کروا لینے پر قادر ہیں۔

مفہوم نمبر ۲: ہم خود ان مقدس شخصیات کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کریں کہ آپ ہمارے لئے فلاں فلاں چیز ربُّ العالمین کی بارگاہ سے طلب فرمائیں اور ہمارا فلاں فلاں مقصد رب کی بارگاہ میں پیش کر کے اس کی منظوری کی درخواست کریں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ آپ کے اُٹھے ہوئے ہاتھوں کو اللہ تعالیٰ خالی نہیں لوٹائے گا۔

مفہوم نمبر ۳: مقدس شخصیات کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس عقیدے کے ساتھ وسیلہ بناتے ہوئے پیش کرنا کہ اے پروردگار! چونکہ یہ ہستیاں ہمیشہ تیری اطاعت گزار اور فرمانبردار رہی ہیں اور انہیں تیری فرمانبرداری سے سرمو انحراف نہ تھا۔ چونکہ یہ تیری محبوب ہستیاں ہیں اِس بناء پر ہم انہیں وسیلہ بناتے ہوئے تیری بارگاہ میں عرض گزار ہیں کہ ہماری فلاں فلاں حاجت یا ہمارا فلاں مقصد ان کے وسیلے یا ان کے صدقے سے پورا فرما دے۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا مفہوم نمبر ۱ کی دونوں شقیں لغو اور مشرکانہ ہیں۔ جب ہم ان کی وضاحت کریں گے تو آپ یہ بات جان لیں گے کہ یہ عقیدہ اُن حضرات کے وسیلہ ہونے کو بیان نہیں کر رہا بلکہ اُن کے معبود اور الٰہ بنائے جانے کو ظاہر کر رہا ہے۔

بالترتیب اِس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے

شق نمبر ۱ یہ اعتقاد رکھنا کہ اللہ چاہے یا نہ چاہے، یہ حضرات ہمارا کام کر دیں گے۔

اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ بذاتِ خود کام کرنے والے ہیں۔ اس میں انہیں کسی دوسرے کی احتیاج نہیں تو ایسی صورت میں یہ حضرات ایسے مختار ہوں گے جن کی راہ میں کوئی شے رکاوٹ نہیں بن سکتی ہے اور اسی بات کا اظہار تو اس جملے سے ہو رہا ہے کہ اللہ چاہے یا نہ چاہے یہ لوگ ہمارا کام کر دیں گے یعنی اگر اللہ تعالیٰ اُن کے کام میں رُکاوٹ ڈالنا بھی چاہے تو اس کے باوجود بھی وہ ایسا نہ کر سکے گا۔ پس جب اس عقیدے سے انہیں پکارا جائے گا تو ایسا پکارنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انہیں مستعانِ حقیقی نہ مان لیا جائے۔

واضح رہے کہ مستعان اُسے کہا جاتا ہے جس سے مدد طلب کی جائے اور ہم اپنے کاموں میں ایک دوسرے سے مدد طلب کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے مُستعان تو بے شمار لوگ ہو سکتے ہیں جبکہ مُستعانِ حقیقی کا مطلب یہ ہے کہ جس سے مدد طلب کی جا رہی ہے وہ خود حقیقتاً مدد کرنے والا ہو یعنی وہ مدد کرنے میں کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو کیونکہ اگر وہ محتاج ہوا، تب تو یہ اعتقاد رکھنا ہوگا کہ یہ حقیقتاً اس کام کے کرنے پر قادر نہیں کہ اگر اچانک کوئی رکاوٹ آ گئی تو ممکن ہے یہ کام اُس سے نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں یہ مُستعانِ حقیقی قرار نہ پائے گا مگر جب یہ اعتقاد ہو کہ اُس کیلئے کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہیں چاہے وہ کسی کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو، تبھی وہ مُستعانِ حقیقی ہوگا جبکہ اُمتِ مسلمہ کے تمام مکاتب فکر کے نزدیک یہ بات مُسلَّم ہے کہ یہ خصوصیت محض اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ہے یعنی اُس کے بغیر کوئی مُستعانِ حقیقی نہیں کیونکہ جو شخص بھی کسی کی مدد کر رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور توفیق سے ہے یعنی وہ حقیقتاً مددگار نہیں ہے۔ اس لئے کسی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ ایسا خود مختار ہے کہ اس کی راہ

میں کوئی دوسرا رکاوٹ نہیں بن سکتا چاہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کیوں نہ ہو یعنی یہ اعتقاد رکھنا کہ اللہ چاہے یا نہ چاہے یہ لوگ ہمارا کام کر دیں گے۔ یہ عقیدہ تو انہیں مُستعانِ حقیقی مانے بغیر ممکن نہیں۔

پس یہ عقیدہ مُشرکانہ ہوا کیونکہ اُس نے جس کو مُستعانِ حقیقی تسلیم کرلیا ہے درحقیقت اُس نے اُسے اپنا معبود بنالیا کیونکہ کسی کو مُستعانِ حقیقی مان لینا اُسے معبود بنالینے کے مترادف ہے جبکہ معبود سوائے اللہ تعالیٰ عزوجل کے کوئی اور نہیں۔

شق نمبر ۲ یہ حضرات اللہ تعالیٰ سے زبردستی کام کروا لینے پر قادر ہیں۔

یہ عقیدہ بھی مشرکانہ ہے کیونکہ اِس صورت میں یہ حضرات وسیلہ نہ رہیں گے بلکہ یہ ایسے افراد قرار پائیں گے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی زبردستی کر سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کے سامنے مجبور ہو جاتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ قادر ہوئے اور اللہ تعالیٰ مجبور۔ اور آپ یہ بات جانتے ہیں کہ معبود کبھی بھی مجبور نہیں ہوتا۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ جس کے سامنے اللہ تعالیٰ مجبور ہو جائے تو معبود تو پھر وہ ہوگا نہ کہ اللہ تعالیٰ۔ اِس عقیدے میں دو خرابیاں لازم آئیں۔

(۱) معبود اور الٰہ ہونا، جو اللہ تعالیٰ کا منصب ہے وہ اس کے لئے تسلیم نہیں کیا جارہا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو مجبور مانا جارہا ہے۔

(۲) جو الٰہ نہیں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ پر قادر ماننے کی بناء پر منصب الوہیت ومعبودیت تسلیم کیا جارہا ہے۔

یعنی اس عقیدے میں یہ خرابی لازم آرہی ہے کہ جو معبود اور الٰہ ہے اس سے اس کے منصب معبودیت والوہیت کی نفی اور جو معبود اور الٰہ نہیں اس کے لئے منصب الوہیت ومعبودیت کو ثابت کیا جارہا ہے جو کہ باطل محض ہے اور اس عقیدے کے غلط اور فاسد ہونے میں امت محمدیہ میں کسی قسم کا کوئی بھی اختلاف نہیں۔

مفہوم نمبر۲: ہم خود اِن مقدس شخصیات کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کریں کہ آپ ہمارے لئے فلاں فلاں چیز رب العالمین کی بارگاہ سے طلب فرمائیں اور ہمارا فلاں فلاں مقصد رب کی بارگاہ میں پیش کر کے اس کی منظوری کی درخواست کریں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ آپ کے اُٹھے ہوئے ہاتھوں کو اللہ تعالیٰ خالی نہیں لوٹائے گا۔

جو حضرات اس وسیلے کو جائز نہیں سمجھتے، اُن کے نزدیک کسی سے دُعا کروانا بھی جائز نہیں ہونا چاہئے کیونکہ جب کوئی شخص کسی سے دُعا کی درخواست کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اُس شخص کو اپنے اور اللہ کے درمیان وسیلہ بنا رہا ہوتا ہے کہ تم میرے لئے اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ پس ثابت ہوا کہ وسیلے کی اس قسم کا انکار دراصل اِسلام کے اُس طریقے کا اِنکار ہے جو ہر زمانے میں مسلمانوں کے ہر گروہ میں مسلّم رہا ہے اور وہ طریقہ ایک دُوسرے سے دُعا کروانے کا ہے۔ فی زمانہ آپ کو کوئی بھی ایسا مسلمان دستیاب نہ ہو سکے گا جو یہ کہے کہ میں نے کبھی بھی کسی سے دُعا کے لئے نہیں کہا۔ یہ بات واضح رہے کہ وہ امور جو مسلمانوں میں متفق علیہ ہیں اُن مسلّمات کا اِنکار گمراہی کے سوا کچھ نہیں اور ایسا کرنے والے کو گمراہ کہا جاتا ہے۔ پس ثابت ہوا وسیلے کی اس قسم کا انکار گمراہی کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ طریقہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانۂ اقدس سے لے کر آج تک امت میں رائج اور نافذ ہے۔

چونکہ دُعا کروانا، **مسلّمات دینیہ** میں سے ہے اور کوئی بھی ذی شعور مسلمان اس کا انکار نہیں کر سکتا ہے اِس لئے اس سلسلے میں بخاری شریف کی صرف ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جسے امام بخاری نے مختلف سندوں سے ذکر کیا ہے۔ ہم

ان تمام کا خلاصہ پیش کیئے دیتے ہیں۔

بخاری شریف **کتاب الاستسقاء** میں حدیث پاک ہے کہ ایک مرتبہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خطبہ جمعہ اِرشاد فرما رہے تھے کہ مسجد کے دروازے سے ایک دیہاتی شخص حاضر ہوا، اُس نے عرض کی یارسول اللہ! قحط کی بناء پر اور چارہ نہ ہونے کی وجہ سے جانور ہلاک ہو گئے اور بارش نہ ہونے اور گرد وغبار کی کثرت کی بناء پر راستوں کے نشانات مٹ گئے اور ہمارے گھر منہدم ہو گئے۔

لوگ کھڑے ہو گئے اور دہائی دینے لگے کہ یارسول اللہ! بارش رُک گئی ہے۔ درخت بے رنگ ہو گئے ہیں اور گھر والے بھوکے مرنے لگے اور لوگ ہلاک ہونے لگے۔ راستے دشوار گزار ہو گئے اور چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا ہے۔ آپ ہمارے لئے سیرابی کی دُعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر مینہ برسائے اور ہمیں سیراب فرمائے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں مبارک ہاتھوں کو اُٹھایا اور رب کی بارگاہ میں اس طرح عرض گزار ہوئے، یا اللہ! تو ہمیں سیراب فرما دے۔ حضرت انس بن مالک نے فرمایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ دُعا فرمانے سے پہلے آسمان میں ہم نے بادل کا ذرا سا ٹکڑا بھی نہ دیکھا تھا اور **سَلْع** جو کہ مدینہ منورہ میں مشہور پہاڑ ہے، اس کے اور ہمارے درمیان کسی قسم کی کوئی بھی رُکاوٹ نہ تھی (کہ جس کی بناء پر ہم یہ سمجھتے کہ بادل وغیرہ پہلے سے موجود تھے) بلکہ اچانک اس پہاڑ کے پیچھے سے بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جو ڈھال کی طرح تھا، نمودار ہوا پھر وسط آسمان میں پہنچ کر پھیلنا شروع ہوا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ بادل پہاڑوں کی طرح اُمڈ اُمڈ کر آرہے ہیں۔ پھر ایسی بارش برسی کہ ابھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام منبر سے نیچے نہ اُترے تھے کہ میں نے آپ ﷺ کی داڑھی مبارک پر بارش برسنے کو دیکھا (یعنی آپ ﷺ کی داڑھی مبارک سے بارش کے قطرے ٹپک رہے تھے) اگلے جمعہ تک مسلسل بارش ہوتی رہی پھر اُسی طرح اگلے جمعہ

کوئی دیہاتی کھڑا ہوا۔ اُس نے عرض کی، یارسول اللہ! اب تو مینہ کی کثرت کی بناء پر عمارتیں گرنے لگی ہیں اور ہمارے مال مویشی غرق ہونے لگ گئے ہیں اور حضور کیچڑ کی بناء پر راستے بند ہو گئے ہیں۔ پس آپ اللہ تعالیٰ سے بارش کے رکنے کی دُعا فرمائیے۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لوگوں کی یہ کیفیت دیکھی تو مسکرا دیئے۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک سے اشارہ فرمایا اور رب کی بارگاہ میں عرض کیا کہ یا اللہ! ہمارے اردگرد بارش ہو، ہم پر نہ ہو۔ بس آپ کا اِتنا کہنا تھا اور ہاتھ کا اِشارہ فرمانا تھا کہ بادل پھٹتا اور چرتا چلا گیا جس طرح کہ کپڑا پھٹ جاتا ہے۔ پس اردگرد بارش ہوتی رہی مگر مدینہ منورہ میں ایک قطرہ بھی نہیں پڑتا تھا۔ مدینہ منورہ کا نقشہ اور اس کی سرسبزی وشادابی تاج کی طرح دِکھائی دیتی تھی۔ حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ اس دُعا کے بعد مسجد سے جب باہر نکلے تو ہم سورج کی شعاعوں میں چل رہے تھے۔ لیکن بارش کے پانی کی کثرت مدینہ منورہ کے اردگرد اِتنی زِیادہ رہی کہ پہاڑی نالوں میں سے ایک نالہ جسے قناۃ کہا جاتا ہے ایک مہینہ تک بہتا رہا اور جو شخص بھی باہر سے مدینہ منورہ میں آتا وہ اس بے پناہ برسنے والی بارش کا تذکرہ ضرور کرتا تھا۔

ہماری سابقہ عبارت اور دلائل کو پڑھ لینے کے بعد اگر کوئی شخص بہانے تراشتے ہوئے یہ بات کہے کہ ایک دُوسرے سے دُعا کروانا یقیناً جائز ہے اور ہم بھی اسے جائز سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ایک مسنون طریقہ ہے لیکن واضح رہے کہ کسی سے دُعا کروانے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہوتا ہے کہ ہم کسی کو وسیلہ بنا رہے ہیں۔

یہ ایسی بات ہے جس پر جتنا ہنسا جائے اُتنا کم ہے کیونکہ وسیلہ بنایا بھی جا رہا ہے اور ساتھ ساتھ اِنکار بھی کیا جا رہا ہے۔

تعجب تو اس پر ہے کہ یہ کیوں نہیں تسلیم کر لیا جاتا کہ چونکہ ہم ایک دُوسرے سے دُعا کرواتے ہیں اور یہ مسنون طریقہ بھی ہے اور ظاہر ہے دُعا کرنے والا ہمارے

اور اللہ کے درمیان وسیلے کا کام دے رہا ہوتا ہے اس بناء پر اللہ کے بندوں کو وسیلہ بنانا جائز ہے۔

نا معلوم کیا وجہ ہے کہ ایک دُوسرے سے دُعا کرانے کے عمل کو وسیلے کا نام دینا گناہ سمجھ لیا گیا ہے جبکہ یہ بھی ایک دُوسرے کو وسیلہ ہی بنانا ہے۔ اِس سلسلے میں ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

ایک شخص جس کو ڈاکٹر نے نمک کھانے سے بالکل منع کر دیا اور کہا تمہاری بیماری اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اب وہ ذرا سے بھی نمک کی متحمل نہیں اور اگر تم نے نمک استعمال کیا تو اب ہماری کوئی ذمہ داری نہیں۔

ان ڈراؤنے قسم کے جملوں کے سن لینے کے بعد وہ نمک سے خوف کھانے لگا اور اس نے مکمل طور پر پرہیز شروع کر دیا۔ ایک طویل عرصے تک بالکل پھیکا کھانا کھاتا رہا۔ بہر حال بندہ بشر ہے ایسے کھانے سے بالآخر تنگ آ گیا اور جب اس کی طبیعت اس قسم کی غذا سے زچ ہو گئی تو تنگ آمد بہ جنگ آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔

چونکہ وہ اپنی برادری کا وڈیرہ اور چوہدری تھا۔ بس اُس نے اپنی تمام برادری کو جمع کیا اور اپنے سامنے پھیکا سالن، روٹی اور نمک سے بھری ہوئی پلیٹ رکھ لی اور پھر لوگوں سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا کہ اے بھائیو! آپ جانتے ہو کہ ڈاکٹر نے مجھے نمک کھانے سے روکا تھا لہٰذا یہ جو میرے سامنے اس وقت نمک رکھا ہے میں اس کا نام تبدیل کرتے ہوئے شکر اور چینی رکھتا ہوں۔ اب یہ نمک نہیں بلکہ چینی ہے اور آپ سب لوگ بھی اس بات پر گواہ ہو جاؤ بلکہ میرے ساتھ مل کر کہو کہ یہ نمک نہیں، چینی ہے۔ ظاہر ہے وہ اپنی برادری کا بڑا تھا۔ ان بیچارے غریبوں کی کیا مجال کہ اس کی ہاں میں ہاں نہ ملاتے۔ پس دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف سے ایک ہی صدا آنے لگی کہ چینی ہے نمک نہیں۔ چینی ہے نمک نہیں۔ جب یہ بازگشت تمام ہوئی تو اس نے نمک

کی، جس کا نام چینی رکھ دیا گیا تھا ایک بھرپور چٹکی بھری اور اپنے سالن پر چھڑکتے ہوئے کہا کہ اے لوگو! تم اس بات پر گواہ ہو کہ میں نمک نہیں بلکہ چینی چھڑک رہا ہوں۔ پھر اُس کے بعد اس نے سالن کو روٹی سے کھانا شروع کر دیا۔ اس تمام واقعے کے بعد اُسکی طبیعت جتنی خراب ہوئی ہوگی اس کے بیان کرنے کی قطعاً حاجت نہیں۔

پس ثابت ہوا کہ نام کی تبدیلی سے کسی چیز کی حقیقت و اصلیت کو نہیں بدلا جاسکتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ دُعا کرانے کو وسیلہ نہیں سمجھتے اور اِس بناء پر ایک دُوسرے سے دُعائیں کراتے رہتے ہیں کہ یہ وسیلہ نہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ اُن کا یہ کرنا اُن کے عقیدے کے ساتھ موافق ہوگا بلکہ جس طرح نمک کے نام کی تبدیلی مزاج کے ساتھ موافقت کا سبب نہیں بن سکتی ہے اِسی طرح ایک دُوسرے سے دُعا کراتے رہنا جو کہ دراصل ایک دُوسرے کو رب کی بارگاہ میں وسیلہ بنانا ہے اسے وسیلے کا نام نہ دینے سے وسیلہ بنانے سے بچ جائیں گے! یہ محض ایک غلط اور باطل و فاسد مفروضہ ہے جبکہ حقیقت تو حقیقت رہتی ہے۔ کیونکہ دُعا میں حقیقتاً وہ ایک دُوسرے کو وسیلہ ہی بنا رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا منکرین وسیلہ کے لئے یہ بات قطعاً جائز نہیں کہ وہ ایک دُوسرے سے دُعا بھی کرائیں اور اسے وسیلہ بھی تسلیم نہ کریں بلکہ اُنہیں یہ بات جان لینی چاہئے کہ وہ ایک دُوسرے سے دُعا کرانے کی بناء پر اپنے عقیدے کو فاسد کر رہے ہیں۔ پس یا تو وہ وسیلے کو تسلیم کریں یا دُعائیں کرانا ختم کریں۔ (دو رنگی چال مسلمان کو کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی)

اور یہ بات بھی واضح رہے کہ وہ اپنے والدین، بیوی بچوں اور دیگر دوستوں اور ساتھیوں کے لئے بھی دعا نہیں کر سکتے کیونکہ اگر انہوں نے کسی دوسرے کیلئے دُعا کی تو ایسی صورت میں وہ بذاتِ خود اللہ تعالیٰ اور اس بندے کے درمیان وسیلہ بن جائیں گے۔

ہاں! اِنسان ویسے تو دُعا ہر عام وخاص شخص سے کرالیتا ہے مگر دور دراز کا سفر طے کر کے دُعا کروانے کے لئے اُسی کے پاس جاتا ہے جس کے بارے میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ ان کی دُعا اللہ کے نزدیک ہماری دُعاؤں کی بہ نسبت زِیادہ قبولیت کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی واضح دلیل تو بخاری شریف کی مذکورہ بالا وہ حدیث ہے جس میں صحابہ کرام نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہِ اقدس میں بارش برسنے اور اس کے روکنے کے متعلق دُعا کی درخواست کی تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وہ واحد ہستی ہیں جن کی دُعا مخلوق میں سب سے زِیادہ مقبول ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ اس اُمت میں بعض ایسے مقدس لوگوں کا گروہ ہمیشہ پایا جاتا ہے جن کی دُعا اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرفِ قبولیت رکھتی ہے اور انہی مخصوص لوگوں میں سے ایک فرد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابی حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ جیسا کہ بخاری شریف میں حدیث پاک ہے

حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کی پھوپھی حضرت رُبَیع نے کسی لڑکی کا دانت توڑ دِیا۔ اُس کے بعد آپ کی قوم کے لوگوں نے معافی تلافی کی کوشش کی مگر لڑکی والوں نے اِنکار کر دِیا۔ پھر اُن لڑکی والوں کو دیت (یعنی دانت کا جرمانہ) لینے کو کہا۔ انہوں نے یہ لینے سے بھی اِنکار کر دیا پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے اور انہوں نے قصاص کا مطالبہ کیا (کہ یارسول اللہ ﷺ، ہمیں دانت کے بدلے دانت چاہئے) پس رسول اللہ ﷺ نے شرعی قانون کے مطابق قصاص کا فیصلہ فرمادِیا تو اس پر حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے سرکارِ دو عالم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا میری پھوپھی رُبَیع کا دانت توڑا جائے گا؟ نہیں یارسول اللہ ﷺ، مجھے اُس ذات کی قسم، جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اُن کا دانت نہیں توڑا جائے گا تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے اِرشاد فرمایا کہ اے انس بن نضر، کتاب اللہ

قصاص کا مطالبہ کرتی ہے۔

یعنی السن بالسن کہ دانت کے بدلے دانت ہے

بس اسی اثناء میں لڑکی والے راضی ہو گئے اور اُنہوں نے معاف کر دیا۔

تو اس موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اِرشاد فرمایا کہ اللہ کے بندوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر وہ اللہ پر مان رکھ کر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اُن کی قسم کو ضرور پورا کر دِکھاتا ہے (جیسا کہ انس بن نضر نے قسم کھائی اور اللہ تعالیٰ نے اسے پورا فرما دیا۔) (بخاری شریف جلد دوم، صفحہ ٦٤٦)

اِسی سلسلے کی ایک حدیث ہم علامہ ابن تیمیہ کی کتاب التوسل والوسیلة سے پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم ایک انصاری کے پاس گئے جو سخت بیمار تھا۔ وہ صحت یاب نہ ہوا اور وفات پا گیا۔ ہم نے اُس پر اُس کا کپڑا ڈال دِیا اُس کے سرہانے بہت بوڑھی کبڑی والدہ موجود تھی۔ ہم میں سے کسی نے اُس سے کہا کہ ''اے بی بی! اپنی مصیبت پر صبر کر''۔ اُس نے کہا کہ ''کیا ہوا؟ کیا میرا بیٹا فوت ہو گیا ہے؟'' ہم نے جواب دِیا کہ ہاں! اُس نے کہا کہ ''جو کچھ تم کہہ رہے ہو، وہ سچ ہے؟'' ہم نے کہا ہاں! اِس پر اُس نے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور یہ دُعا کی

اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ تَعْلَمُ اَنِّیْ اَسْلَمْتُ وَهَاجَرْتُ اِلٰی رَسُوْلِکَ رَجَاءَ اَنْ تُعَقِّبَنِیْ عِنْدَ کُلِّ شِدَّةٍ فَرَجًا فَلَا تَحْمِلْ عَلَیَّ هٰذِهِ الْمُصِیْبَةَ الْیَوْم۔

''اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں نے اِسلام قبول کیا اور تیرے رسول کی طرف ہجرت کی اِس امید پر کہ ہر مصیبت میں تو میری دستگیری کرے۔ پس آج یہ مصیبت مجھ پر نہ ڈال۔''

حضرت انس بن مالک جو کہ راوی ہیں، کہتے ہیں کہ اِس دُعا کے بعد انہوں نے اس شخص کے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو وہ زِندہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ ہم نے اُس کے ساتھ

کھانا کھایا۔ (کتاب الوسیلة، مترجم ص ۳۲۰)

راقم الحروف مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کی تشریح میں اِتنی بات عرض کرتا ہے کہ مصیبت اور پریشانی میں صحابہ کا قسم کھانے اور قبولیت دُعا کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات بابرکات کو بطور وسیلہ پیش کرنے کا انداز ملاحظہ فرمائیے۔

اوّل حدیث میں حضرت انس بن نضر ﷛ نے یہ کلمات کہے

والذی بعثک بالحق لا تکسر ثنیتها.

''مجھے اس ذات کی قسم، جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ ان کا دانت نہیں توڑا جائے گا۔''

دُوسری حدیث میں صحابیہ نے یہ کلمات کہے

اِنی اسلمت وھاجرت الیٰ رسولک رجاء ان تعقبنی عند کل شدة فرجا

''میں اِیمان لے کر آئی اور میں نے تیرے رسول کی طرف ہجرت کی اِس اُمید پر کہ میری ہر مشکل حل ہوگی۔''

ملاحظہ فرمائیے کہ مذکورہ بالا دونوں حدیثوں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذِکر مبارک کو کس خوبصورت انداز سے اپنے کلام میں پرودیا گیا کہ کلام کی قبولیت واجابت فوری ہو جائے اور وہ ہو بھی گئی۔

مقربین بارگاہ ایزدی کی دُعاء کی قبولیت میں تردد کیسے کیا جاسکتا ہے کیونکہ اللہ رب العزت نے تو دیگر عظمتوں اور رفعتوں کے ساتھ ساتھ خود اپنے ذمہ کرم سے ان کے مانگنے پر عطا کرنے کا بھی وعدہ فرمایا ہے کہ اگر وہ مانگیں تو میں انہیں ضرور عطا کروں گا۔ جیسا کہ درج ذیل حدیث قدسی اس پر شاہد ہے۔

قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ قال من عادیٰ لی ولیا فقد

اذنتہ بالحرب وماتقرب الی عبدی بشیء احب الی
مما افترضت علیہ وما یزال عبدی یتقرب الی
بالنوافل حتی احببتہ فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی
یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ التی یبطش بھا
ورجلہ التی یمشی بھا وان سألنی لا عطینہ ولان
استعاذنی لا عیذنہ (بخاری شریف: ص۹۶۳، ج۲)

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے میرے ولی سے دشمنی کی۔ میرا اس سے اعلان جنگ ہے اور میرا بندہ میری کسی پسندیدہ چیز کے ذریعے میرا وہ قرب حاصل نہیں کرتا جو میرے فرائض کے ذریعے حاصل کرتا ہے اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں جب اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کی سمع ہوجاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی بصر ہوجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کا ہاتھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں ہوجاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اس کو ضرور دوں گا اور اگر وہ مجھ سے میری پناہ طلب کرے تو اسے میں ضرور اپنی پناہ دوں گا۔

یہ حدیث پاک مقربین خدا کی فضیلت اور رفعت کے بیان میں چمکتی دمکتی دلیل ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔

حدیث پاک میں مختلف کلمات ارشاد ہوئے جن کی لوگوں نے نہایت بے معنی توجیہات پیش کرنے کی کوشش کی جبکہ ان کے جوابات میرے شیخ میرے مرشد حضرت

غزالیٔ زماں اوران کے علاوہ دیگر علمائے حقہ نے دیئے لیکن سردست تو میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ کیا اس حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشادنہیں ہوا؟

''اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اسے ضرور دوں گا۔'' کیا یہ جملہ اس بات کی واضح دلیل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کے دروازے ہمہ وقت ان حضرات کیلئے کھلے رہتے ہیں۔ پس اسی بناء پر ہم اُن کی بارگاہوں میں حاضر ہوکر دُعا کی درخواست کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا آپ سے وعدہ ہے کہ آپ جو کچھ مانگیں گے وہ ضرور عطا فرمائے گا۔ لہٰذا آپ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے طلب کیجئے تاکہ ہماری حاجتیں آپ کے وسیلہ سے پوری ہوجائیں۔

مقدس حضرات کواللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ بنانے کے تیسرے مفہوم کی وضاحت

مقدس شخصیات کواللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس عقیدے کے ساتھ وسیلہ بناتے ہوئے پیش کرنا کہ اُے پروردگار! چونکہ یہ ہستیاں ہمیشہ تیری اطاعت گزار اور فرمانبردار رہی ہیں اور انہیں تیری فرمانبرداری سے سرموانحراف نہ تھا اور چونکہ یہ تیری محبوب ہستیاں ہیں اِس بناء پر ہم انہیں تیری طرف وسیلہ بناتے ہوئے تیری بارگاہ میں عرض گزار ہیں کہ ہماری فلاں فلاں حاجت یا ہمارا فلاں مقصد ان کے وسیلے یا ان کے صدقے سے پورا فرمادے۔

نامعلوم کیوں، لوگوں نے وسیلے کے اس طریقے کو اختلافی بنادِیا ہے جبکہ یہ قرآن پاک اوراحادیث مبارکہ سے مکمل طور پر ثابت ہے جسے ہم عنقریب پیش کریں گے اور جب آپ اِس بارے میں ذرا سا غور کریں گے تو یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ اس طرح سے وسیلہ بنانا، یہ تو قرآن وحدیث کے عین مطابق ہے اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اِس مسئلے میں خود ہی اختلاف کر کے اور اس

اختلاف کو میڈیا کے ذریعے سے ہوا دے کر یہ شور مچانا شروع کر دِیا کہ چونکہ یہ اختلافی مسئلہ ہے اور ہمیں اختلاف سے بچنا چاہئے کیونکہ انہی اختلافات نے تو ہمارا جینا دوبھر کر دِیا ہے اِس لئے ہم اِس طرح کے وسیلے کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔

اِس سلسلے میں اِتنا عرض ہے کہ اگر ہم اختلافی مسائل سے اسی قدر متنفر ہیں اور اختلاف کو اِتنا ہی ناپسند کرتے ہیں تو بھلا یہ تو بتائیے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں ہر زمانے میں بے پناہ اختلاف پایا جاتا رہا ہے اور فی زمانہ بھی کروڑوں لوگ اس میں مبتلا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہے بھی کہ نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی دہریہ آپ سے کہے کہ چونکہ ہمیں اختلاف سے بچنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ لوگوں کے مابین بہت زِیادہ اختلافی ہے پس ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے، نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں گفتگو کر کے اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے متنازعہ فیہ بنالیں اور خواہ مخواہ ایسے اختلافی مسئلے میں پڑ جائیں جس کا واضح حل نظر نہیں آتا ہے۔ اِس لئے ہمیں اس اور اِس جیسے دیگر اختلافی مسائل سے بچنا چاہئے۔

اب آپ ملاحظہ فرمائیے کہ جب ذات باری تعالیٰ ہی متنازعہ فیہ قرار پائی تو اس کی عبادات اور احکام کی کیا حیثیت باقی رہ جائے گی۔

یہ ساری خرابی اِس لئے لازم آئی کہ ہم نے خود ساختہ ایک مفروضہ قائم کرلیا ہے کہ جناب اختلاف سے بچو، اختلاف میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

حالانکہ ہمیں اس دہریئے کے جواب میں یہ کہنا ہے، تم جیسے جہلِ مرکب میں مبتلا لوگوں کے اس جاہلانہ اختلاف سے کوئی بھی فرق نہیں پڑتا اور تمہارے لئے ہم صرف اتنی بات کہتے ہیں کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے وجود یعنی ہونے کو اختلافی بنایا ہے لیکن ہم اللہ تعالیٰ کے عدم اور اس کے نہ ہونے کو اختلافی قرار دیتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی بڑی کائنات کا نظام کسی کی قدرت کے بغیر چل رہا ہو یعنی اس بات پر تعجب

نہیں کہ اس انتہائی حسین نظام کو کوئی چلا رہا ہو بلکہ تعجب تو اِس بات پر ہو سکتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس ساری کائنات کا حسین وجمیل نظام بغیر کسی قادر وقدیر کے چل رہا ہو یعنی کوئی اسے قائم رکھنے والا نہ ہو۔ پس ہم تمہیں یہ کہتے ہیں کہ چونکہ اختلاف اللہ تعالیٰ کے نہ ہونے کے بارے میں ہے اِس لئے تم اِس اختلاف سے بچو اور اُس کے وجود کو تسلیم کرلو۔

جس طرح تم نے ہمیں یہ کہہ کر کہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں اختلاف ہے اللہ تعالیٰ سے دور کرنے کی کوشش کی ہم تم سے یہ کہتے ہوئے کہ یہ اختلاف اللہ تعالیٰ کے عدم یعنی نہ ہونے کے بارے میں ہے تمہیں اللہ تعالیٰ کے قریب کرنا چاہتے ہیں تاکہ تم ہمیشہ کی فلاح سے حصہ پاؤ۔

الغرض یہ کہ جب چند نادیدہ لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں بھی اختلاف کرنے لگیں لیکن اس کے باوجود ہمیں اُس کی ذات اُس کی عبادات واحکام کو تسلیم کرلینے میں کوئی تردد نہیں ہے تب اگر چند نادان لوگ اپنی نادانی اور حماقت کے باعث مقدس حضرات یا ان کے تبرکات کو وسیلہ بنانے میں اختلاف کر بیٹھے ہیں تو ہمیں اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کے جواب میں علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھنا چاہئے

ع تُندیٔ بادِ مُخالف سے نہ گھبرا اے عُقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لئے

خُلاصۂ کلام یہ ہوا کہ اس قسم کے لایعنی اعتراضات کی طرف توجہ کرنا ذی شعور لوگوں کا شیوہ نہیں۔

اب ہم قرآنِ مجید اور احادیث مبارکہ سے واضح طور پر یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ ان مقدس شخصیات کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بطور وسیلے کے پیش کرنے

سے ہماری حاجات پوری ہوتی ہیں اور مشکلیں حل ہوتی ہیں اور اس طرح سے وسیلہ پیش کرنا بالکل جائز ہے۔

اِسی سلسلہ میں اب ہم ایک ایسی آیت کریمہ تحریر کرتے ہیں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلہ بنائے جانے کے بارے میں نہایت واضح اور پختہ دلیل ہے۔ دیکھئے رَبُّ العالمین نے ارشاد فرمایا

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا○

(النساء، آیت ۶۴)

"اور اگر وہ کبھی اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے تو آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو جاتے پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول بھی اُن کے لئے مغفرت طلب فرماتے تو یقیناً وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ قبول فرمانے والا اور بے حد رحم فرمانے والا پاتے۔"

اِس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے گناہ گاروں کو بخشش کی راہ دِکھلائی ہے کہ جب ان سے گناہ یا غلطی ہو جائے تو وہ آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوں پھر اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کریں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہِ اقدس میں التجاء کریں کہ آپ ﷺ بھی اللہ تعالیٰ سے ہماری بخشش طلب فرمائیں اور جب یہ سب کچھ ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور بخشش ان لوگوں کو ڈھانپ لے گی۔ اس آیت کریمہ میں حصولِ بخشش کا ایک ضابطہ اور قانون پیش کر دِیا گیا ہے اور واضح رہے کہ یہ قانون ہمیشہ کے لئے ہے۔ جیسا کہ اِس سلسلے میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے جس کا ذِکر مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کو دفن کر کے

فارغ ہوئے تو اس کے تین روز بعد ایک گاؤں والا آیا اور قبر شریف کے پاس آ کر، گر گیا اور زار زار روتے ہوئے آیت مذکورہ کا حوالہ دے کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ اگر گنہگار، رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور رسول ﷺ اس کے لئے دُعائے مغفرت کر دیں تو اُس کی مغفرت ہو جائے گی اِس لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ میرے لئے مغفرت کی دُعا کریں۔ اُس وقت جو لوگ حاضر تھے اُن کا بیان ہے کہ اِس کے جواب میں روضۂ اقدس کے اندر سے یہ آواز آئی قَدْ غُفِرَ لَکَ یعنی تیری مغفرت کر دی گئی۔ (معارف القرآن جلد۲ صفحہ ۴۶۰)

مزید اب ہم وہ مشہور حدیث پیش کرتے ہیں جو امت مسلمہ کے تمام فرقوں کے نزدیک یقیناً مستند اور قابل قبول ہونی چاہئے۔ ملاحظہ ہو

عن انس بن مالک ان عمر بن الخطاب ؓ کان اذا قحطوا استسقی بالعباس بن عبد المطلب ؓ فقال اللّٰھم انا کنّا نتوسل الیک بنبینا ﷺ فتسقینا وانّا نتوسل الیک بعم نبینا فاسقنا قال فیسقون.

(بخاری شریف، ج۱، ص۱۳۷)

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ جب قحط سالی ہوتی تو حضرت عمر ؓ، سیدنا عباس بن عبد المطلب کے وسیلے سے بارانِ رحمت کی دُعا کیا کرتے تھے اور عرض کرتے تھے، اے اللہ! ہم ہمیشہ اپنے نبی ﷺ کو تیری طرف وسیلہ بناتے تھے تو تُو ہمیں سیراب فرماتا تھا آج اپنے نبی ﷺ کے چچا حضرت عباس کو تیری بارگاہ میں وسیلہ بناتے ہیں۔ پس تو ہمیں سیراب فرما۔ حضرت انس بن مالک نے فرمایا کہ اِس دُعا

کے فوراً بعد اُن پر بارش برسائی جاتی تھی۔"

اگر اِس حدیث پاک سے یہ استدلال کیا جائے کہ چونکہ سیدنا حضرت عمر بن خطاب ﷜ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال پاک کے بعد حضور ﷺ کے بجائے آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس ﷜ کو وسیلہ بنایا تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ جو اِس دُنیا سے وصال فرما جائیں اُنہیں وسیلہ بنانا جائز نہیں۔ اِس بناء پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام و دیگر سابقہ بزرگانِ دین کو وسیلہ بنانا جائز نہیں۔

واضح رہے کہ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ایسا استدلال کرنے والوں کو بات مکمل کرتے ہوئے یوں کہنا چاہئے کہ جو حضرات اِس دُنیا سے رحلت فرما گئے اُن کا وسیلہ پیش کرنا جائز نہیں جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب ﷜ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وسیلہ پیش نہیں کیا لیکن جو برگزیدہ ہستیاں اِس دُنیا میں موجود ہیں جیسے ہمارے مشائخ کرام اور صالحین اساتذہ، اُن کا وسیلہ رب کی بارگاہ میں پیش کرنا چاہئے کیونکہ حضرت عمر بن خطاب ﷜ نے حضرت عباس کا وسیلہ پیش کیا۔ مگر افسوس تو اِس بات پر ہے کہ لوگوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وسیلہ بنانے کی نفی پر تو پورا زور خرچ کر دِیا مگر موجودہ صالحین کو وسیلہ بنانے کے سلسلے میں نوک زبان اور نوکِ قلم کو ذرا سی بھی جنبش نہ دی۔ کاش وہ کم از کم اِتنا کہہ دیتے تو کتنا بہتر ہوتا کہ سید الائمہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ ﷜ سیدنا داتا گنج بخش علی ہجویری، حضور غوث اعظم سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی ﷜، خواجۂ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین علی الترتیب تمام مشائخ کبار، جو بھی قیامت تک آتے رہیں گے، ان کے ہم زماں لوگوں کے لئے یہ بات صحیح اور درست تھی، ہے اور قیامت تک رہے گی کہ ان مشائخ کی ظاہری زِندگی میں ان کا وسیلہ پیش کیا جائے اور رب کی طرف ان کو وسیلہ بنایا جائے جبکہ منکرین نہ اس طرح کہتے ہیں نہ ہی ان کا یہ عقیدہ ہے بلکہ وہ صرف

امت محمدیہ کے دِلوں میں انبیاء اور اولیاء کو وسیلہ بنانے سے ان کا جو احترام پیدا ہوتا چلا آیا ہے اس کو ختم کرنے کے در پئے ہیں۔ یہ اور ان جیسی دیگر باتوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وسیلے کے معترضین وسیلہ کا انکار صرف اس بناء پر کررہے ہیں کہ مقربینِ پروردگار کی شان ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے۔

راقم الحروف کے ۱۹۹۲ء میں تحریر کردہ ایک رسالہ میں حدیث مذکور سے متعلق جو تحقیق پیش کی گئی تھی اس کا ایک اقتباس اس مضمون کی مزید وضاحت کیلئے پیش خدمت ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اس حدیث پاک سے چار باتیں ثابت ہوئیں۔

(۱) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہمیشہ وسیلہ بنایا جاتا تھا۔ تبھی تو حضرت عمر ﷛ نے دُعا اس طرح کی ''اے اللہ! ہم (جماعتِ صحابہ) ہمیشہ اپنے نبی ﷺ کو تیری طرف وسیلہ بناتے رہتے تھے اور آج اپنے نبی ﷺ کے چچا حضرت عباس ﷛ کو تیری بارگاہ میں وسیلہ بناتے ہیں۔''

(۲) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چچا حضرت عباس ﷛ کو وسیلہ بنایا گیا۔

(۳) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت عباس ﷛ نے اپنے وسیلہ بنائے جانے سے منع نہیں فرمایا۔

(۴) برگزیدہ حضرات کے وسیلہ کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ تبھی تو صحابی رسول حضرت انس بن مالک ﷛ نے فرمایا کہ اس دُعا کے فوراً بعد ان پر بارش برسائی جاتی تھی کیونکہ فَيُسْقَوْنَ میں فا، تعقیب مع الوصل کے لئے ہے اور تعقیب مع الوصل کا مفہوم ہوتا ہے فوراً بعد۔

حضرت عباس ﷛ کو وسیلہ بنانے کی وجہ

حضرت عمر ﷛ کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے بعد سیدنا عباس

ؓ کا وسیلہ پیش کرنا دراصل اس بات کی توضیح تھی کہ غیر نبی کو بھی وسیلہ بنانا جائز ہے اور حضور ﷺ کی نسبت کے احترام کا اظہار بھی ہے کہ حضرت عباس ؓ کو وسیلہ بناتے وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چچا ہونے کا حوالہ دیا جاتا تھا یعنی یوں کہا جاتا تھا کہ **بعم نبیک** کہ تیرے نبی کے چچا کے وسیلہ سے سوال کرتے ہیں۔ اس سے یہ مفہوم نہ لیا جائے کہ حضرت عمر ؓ نے حضرت عباس ؓ کو وسیلہ اس لئے بنایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وصال ہو چکا تھا اور وسیلہ وصال کے بعد بنانا جائز نہیں کیونکہ طبرانی فی الکبیر میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بعد از وصال بھی وسیلہ بنایا گیا۔ ملاحظہ ہو۔

حضرت عثمان غنی ؓ کے دورِ خلافت میں ایک شخص اُن سے کسی حاجت کے بارے میں سوال کرنا چاہتا تھا مگر سیدنا عثمانِ غنی ؓ مصروفیاتِ اُمور خلافت کی بناء پر اُس کی طرف توجہ نہ فرما سکے، تو اُس شخص کو ابن حنیف نے کہا کہ تم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلے کی وہ دُعا کیوں نہیں پڑھتے ہو جو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک نابینا کو ارشاد فرمائی تھی تو اس دُعا کے پڑھتے ہی اُس کی آنکھیں ٹھیک ہوگئی تھیں۔

اُس کی ترکیب یہ ہے کہ دو رکعت نماز پڑھ کر اس طرح کہو۔

اللھم انی اسئلک واتوجه الیک بنبینا محمد صلی اللّٰہ علیه وسلم نبی الرحمة یا محمد انی اتوجه بک الی ربک فتقضی حاجتی وتذکر حاجتک (الخ)

ترجمہ: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور اپنے نبی سراپائے رحمت حضرت محمد ﷺ کے وسیلے سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اے محمد ﷺ بے شک میں آپ کے وسیلے سے آپ کے رب کی طرف متوجہ ہوں۔ پس میری حاجت روائی اور مشکل کشائی کی جائے اور اپنی حاجت کو پیش کرو۔ (حاشیہ ابن ماجہ ص ۱۰۰)

علامہ ابن تیمیہ کا عقیدہ:

فتاویٰ ابن تیمیہ میں علامہ ابن تیمیہ اس حدیث پاک کی اصل تحریر کرتے ہیں اور یہ بات واضح رہے کہ جب کوئی عالم دین اپنی کسی تصنیف میں کوئی حدیث استدلال کے طور پر پیش کرے تو وہ حدیث اُس کے نزدیک صحیح ہوتی ہے اور اسی لئے فتاویٰ ابن تیمیہ جلد دوم صفحہ ۲۷۶ پر علامہ کہتے ہیں

فهذا توسل به حسن

کہ یہ وسیلہ طلب کرنا اس کے ساتھ بہتر ہے

اب ہم اصل حدیث ابن ماجہ سے پیش کرتے ہیں تا کہ کسی شخص کو کوئی تردد باقی نہ رہے جبکہ اُسے ترمذی شریف میں بھی ذِکر کیا گیا ہے۔

حدیث پاک ملاحظہ ہو۔

عن عثمان بن حنيف ان رجلا ضرير البصر اتى النبى صلى الله عليه وسلم فقال ادع الله لى ان يعا فينى فقال ان شئت اخرت لک وهو خير وان شئت دعوت فقال ادعه فامره ان يتوضأ فيحسن وضوء ه ويصلى ركعتين ويدعو بهذا الدعاء اللهم انى اسئلک واتوجه اليک بمحمد نبى الرحمة يا محمد انى قد توجهت بک الى ربى فى حاجتى هذه لتقضى اللهم فشفعه فى قال ابو اسحق هذا حديث صحيح (سنن ابن ماجه ص ١٠٠)

حضرت عثمان بن حنیف سے روایت ہے کہ کوئی نابینا شخص حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائیے کہ وہ میری آنکھیں ٹھیک کر دے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو صبر کرو اور یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اگر چاہو تو میں دُعا کروں۔ اُس نے عرض کی کہ حضور آپ میرے لئے دُعا کریں، تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُسے حکم دیا کہ وہ اچھی طرح وضو کرے اور پھر

یوں دُعا کرے۔

اللھم انی اسئلک و اتوجہ الیک بمحمد نبی الرحمة یا محمد انی قد توجھت بک الی ربی فی حاجتی ھذہ لتقضی اللھم فشفعه فی

حضرت عثمان بن حنیف نے کہا کہ بخدا ابھی ہماری مجلس برخاست بھی نہ ہوئی تھی اور سلسلہ گفتگو اسی طرح جاری تھا کہ اسی اثناء میں وہ شخص اس صورت میں آیا کہ اسے آنکھوں کی کوئی تکلیف کبھی ہوئی ہی نہ تھی۔

(دلائل النبوة للبیھقی ج٦، ص١٦٧)

ایک خوبصورت نکتہ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس نابینا صحابی سے فرمایا اگر چاہو تو میں دُعا کروں تو انہوں نے عرض کیا حضور آپ دُعا فرمائیں۔ لیکن اس کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں فرمایا کہ آپ تازہ وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کریں اور پھر میرے وسیلے سے دُعا کریں جبکہ ہونا تو یوں چاہئے تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خود ان کیلئے دُعا فرماتے، جبکہ آپ نے ان سے دُعا فرمانے کا وعدہ بھی فرمالیا تھا اور ظاہر ہے نبی کا وعدہ کبھی بھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا وعدہ یقیناً پورا فرمایا۔ وہ اس طرح کہ جب انہوں نے دُعا میں یہ کلمات ادا کئے۔

یا محمد الخ

کہ اے محمد عربی ﷺ میں نے آپ کے وسیلے سے اپنے رب کی بارگاہ میں اپنی حاجت پیش کی ہے پس میری حاجت روائی اور مشکل کشائی کی جائے۔ تب لازماً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس وقت رب کی بارگاہ میں اس کیلئے دُعا کرتے ہوئے اس کی سفارش کی ہوگی۔

اور حضرت عثمان غنی کا واقعہ جو پچھلی سطور میں گزر چکا ہے جس میں حضور علیہ

الصلوٰۃ والسلام کے وصال پاک کے بعد آپ کے وسیلے سے دُعا کی گئی اور وہ پوری بھی ہوئی، سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بعد از وصال بھی اپنے ان امتیوں کیلئے یقیناً دُعا فرماتے ہیں جو اس دُعا کو پڑھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلے سے رب سے دُعا مانگتے ہیں۔

پس یہ حدیث حیات النبی اور علم مصطفیٰ کی واضح دلیل ہے۔

مزید یہ کہ مجمع الزوائد ودیگر کتب میں حدیث پاک ہے کہ بیک وقت زندہ اور وصال شدہ حضرات کا وسیلہ پیش کیا گیا۔

حدیث شریف

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ جب حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم کا انتقال ہوا تو نبی اکرم ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے ان کی قبر کھودی اور اپنے مبارک ہاتھوں سے مٹی نکالی اور جب آپ فارغ ہوئے تو پھر آپ قبر میں داخل ہوئے اور لیٹ کر یہ دُعا فرمائی

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَهُوَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ اِغْفِرْ لِاُمِّیْ فَاطِمَةَ بِنْتِ اَسَدٍ وَّلَقِّنْهَا حُجَّتَهَا وَوَسِّعْ عَلَیْهَا مَدْخَلَهَا بِحَقِّ نَبِیِّکَ وَالْاَنْبِیَآءِ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِیْ فَاِنَّکَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ، وَکَبَّرَ عَلَیْهَا اَرْبَعًا وَّاَدْخَلُوْهَا اللَّحَدَ هُوَ وَالْعَبَّاسُ وَاَبُوْ بَکْرِ نِالصِّدِّیْقُ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ۔

(رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط)

کذا فی مجمع الزوائد، ج ۹، ص ۲۵۷

اللہ وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ زندہ ہے اُسے موت نہیں آئے گی۔ (اے اللہ!) میری ماں فاطمہ بنت اسد کی

مغفرت فرما۔ اسے اس کی حجت القاء فرما (کہ وہ قبر کے سوالات
کے جوابات آسانی سے دے سکے) اور ان کی قبر کو وسیع فرما اپنے
نبی (محمد) ﷺ اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کے وسیلہ سے۔
بے شک تو سب سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔ پھر آپ نے
ان پر نماز (جنازہ) پڑھی چار تکبیر کے ساتھ۔ آپ ﷺ، حضرت
عباس اور حضرت ابو بکر نے انہیں قبر میں اتارا۔

اِس حدیث پاک میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ساتھ ساتھ اُن انبیاء کا بھی وسیلہ پیش کیا جو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے تھے۔

حسین فلسفہ

اِس بحث میں ہم اِس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ کہہ کر وسیلہ بنانا کہ یا اللہ! ہم تیرے اس مقدس بندے کو تیری بارگاہ میں وسیلہ بناتے ہیں تو اس کے صدقے سے ہماری فلاں حاجت پوری فرما دے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ ہم کسی سے دُعا کی درخواست کریں کیونکہ جب ہم کسی شخص کے پاس دُعا کروانے کے لئے جاتے ہیں تو اس کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ اللہ کا یہ مقرب بندہ ہے جب وہ اللہ تعالیٰ سے مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے اُٹھے ہوئے ہاتھوں کو خالی نہ لوٹائے گا اور اِس کی دُعا کو شرفِ قبولیت عطا فرماتے ہوئے ہماری حاجت روائی فرمائے گا۔ جب کسی سے دُعا کروانا یا کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف بطور وسیلہ پیش کرنا، دونوں کی حقیقت ایک ہی ہوئی کیونکہ دونوں صورتوں میں ہم اُس شخص کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی حاجت روائی کے لئے بطور وسیلہ پیش کرتے ہیں۔ تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ لوگ دُعا کروانے کو تو جائز سمجھتے ہیں لیکن کسی ذات کو اللہ تعالیٰ کی طرف

وسیلہ بنانے کو نا جائز قرار دیتے ہیں جبکہ دونوں کا مقصد تو ایک ہی بنتا ہے۔ تو یہاں پر اِنکار کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ جہاں ہم اِس بات کی صراحت کر دیتے ہیں کہ یا اللہ! یہ تیرا مقرب بندہ ہے اس کے صدقے سے تو ہماری دُعا کو قبول فرما لے۔ یہی چیز تو منکرین وسیلہ کے لئے قابل قبول نہیں رہتی ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے نبی یا ولی کی شان کا واضح طور پر اظہار ہو رہا ہوتا ہے۔

ہر زمانے میں بزرگانِ دِین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے اکابرین کا وسیلہ پیش کرتے رہے

علامہ ابن حجر اپنی کتاب **الخیرات الحسان فی مناقب الامام ابی حنیفة النعمان** کی پچیسویں فصل میں فرماتے ہیں کہ امام شافعی جن دِنوں بغداد میں تھے تو آپ امام ابو حنیفہ کا وسیلہ پکڑتے تھے۔ آپ حضرت امام ابو حنیفہ کے مزار پر حاضر ہوتے۔ اس کی زِیارت کرتے پھر اُن پر سلام پیش کرتے پھر اپنی حاجات کے پورا ہونے میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اُن کا وسیلہ پیش کرتے اور امام احمد بن حنبل کا امام شافعی کو وسیلہ بنانا بھی ثابت ہے۔ یہاں تک کہ اُن کے بیٹے حضرت عبداللہ نے جب سوال کیا تو امام احمد بن حنبل نے فرمایا "بے شک امام شافعی لوگوں کے لئے سورج کی مانند ہیں اور بدن کے لئے عافیت کی مانند ہیں" اور جب امام شافعی کو یہ بات پہنچی کہ بے شک اہل مغرب اللہ تعالیٰ کی طرف امام مالک کا وسیلہ پیش کرتے ہیں تو آپ نے ان کا رد نہیں فرمایا اور امام ابوالحسن شاذلی ﷺ فرماتے ہیں کہ جسے اللہ کی طرف حاجت ہو اور وہ اُس کے پورا ہونے کا اِرادہ رکھتا ہو تو اُسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو وسیلہ بنائے اور علامہ ابن حجر نے اپنی کتاب **الصواعق المحرقه** میں ذِکر کیا کہ بے شک امام شافعی اہل بیت نبوی کا وسیلہ بھی پیش کرتے تھے۔ جیسا کہ اُنہوں نے کہا

آل النبی ذریعتی   وھم الیہ وسیلتی

ترجمہ: ''نبی اکرم ﷺ کی آل میرا ذریعہ ہیں اور وہی اللہ کی بارگاہ میں میرا وسیلہ ہیں۔''

أرجوبهم أعطی غدا   بید الیمین صحیفتی

ترجمہ: ''میں ان کے وسیلے سے امید کرتا ہوں کہ کل (قیامت کے دِن) میرا نامۂ اعمال میرے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔''

(شواہد الحق علامہ یوسف نبہانی، ص ۱۶۷، ۱۶۸ مطبوعہ پشاور)

تبرکات کو وسیلہ بنانے کا بیان

''حضرت سہل ؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت بُنی ہوئی حاشیہ والی چادر لے کر نبی کریم ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوئی (حضرت سعد نے کہا) تم جانتے ہو بُردہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا، چادر۔ فرمایا، جی ہاں۔ عورت عرض گزار ہوئی کہ میں نے اسے اپنے ہاتھ سے بُنا ہے تاکہ آپ کو پہناؤں۔ نبی کریم ﷺ نے وہ لے لی اور آپ کو اس کی ضرورت بھی تھی۔ آپ اسے تہبند کی صورت میں باندھ کر ہمارے پاس تشریف لائے۔ فلاں صحابی نے اُس کی تعریف کی اور کہا کہ کتنی اچھی ہے۔ یہ مجھے پہنا دیجئے۔ لوگوں نے کہا تم نے اچھا نہیں کیا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کو اس کی ضرورت تھی اور پھر تم نے یہ جانتے ہوئے سوال کر دِیا کہ آپ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے۔ اُس نے کہا کہ خدا کی قسم! میں نے یہ پہننے کے لئے نہیں مانگی بلکہ اِس لئے مانگی ہے کہ اسے اپنا کفن بناؤں۔ حضرت سہل ؓ نے فرمایا

کہ وہی (چادر) ان کا کفن بنی۔" (بخاری شریف۔ جلد۱، ص۱۷۰)

ظاہر ہے کہ صحابی نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تہبند اِس لئے مانگی تھی کہ وہ اُن کے لئے سختیٔ قبر سے نجات اور اُخروی عروج کا سبب بنے۔ اسے ہی تو کہتے ہیں بزرگانِ دِین کے تبرکات سے برکت حاصل کرنا۔

قرآن پاک سے ثابت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی کو ظاہر کرنے کیلئے قمیص کو بطور وسیلہ ان کی طرف روانہ فرمایا جیسا کہ سورۂ یوسف میں ہے۔ آپ نے فرمایا:

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا۔ (آیت ۹۳)

ترجمہ: "میرا یہ کرتہ لے جاؤ تو اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو۔ اُن کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔"

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ط۔

(آیت ۹۶)

ترجمہ: "پھر جب خوشخبری سنانے والا آیا (تو) اُس نے وہ کرتہ یعقوب (علیہ السلام) کے چہرے پر ڈال دِیا تو وہ فوراً بینا ہو گئے۔"

یہ دونوں آیات بھی اِس بات کی دلیل ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے سیدنا یعقوب علیہ السلام کی بینائی ظاہر کرنے کے لئے اپنی قمیص کو وسیلہ بنایا۔

اب بخاری شریف سے سرِ دست چند روایات پیش کرتے ہیں جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود اپنے مستعمل پانی کو حصولِ برکت اور حصولِ شفا کا ذریعہ قرار دیا اور اس پر صحابہ کرام کا معمول بھی شاہد و گواہ ہے۔

حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا

دعا النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بقدح فیہ ماء فغسل یدیہ ووجھہ فیہ ومج فیہ ثم قال لھما اشربامنہ وافرغا علی وجوھکما ونحور کما (بخاری شریف ص۳۱ ج۱)

کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک بڑا پیالہ منگوایا اس میں پانی بھی تھا۔ پس آپ ﷺ نے اس میں اپنے مبارک ہاتھوں اور چہرۂ انور کو دھویا اور اس میں کلی مبارک فرمائی پھر حضرت بلال اور ابوموسیٰ اشعری سے فرمایا اس میں سے پیو اور اسے اپنے چہرے اور سینوں پر بہالو۔

یعنی یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پاک ہاتھوں اور چہرۂ انور کا دھوون اور کلی مبارک کا پانی خود عطا فرمایا اور ظاہر ہے کہ یہ عطا فرمانا برکت وفیض کیلئے تھا۔

مزید بخاری شریف میں ہے کہ

عن جابر بن عبداللّٰہ قال: جآء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعودنی وانا مریض لا اعقل فتوضأ وصب علی من وضوئہ فعقلت (بخاری ج ۱ ص ۳۲)

حضرت جابر بن عبداللہ ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میری عیادت کیلئے تشریف لائے اور (اس وقت) میں بالکل بے ہوش تھا پس حضور ﷺ نے وضو فرمایا اور اپنے وضو کا پانی مجھ پر ڈالا تو مجھے ہوش آ گیا۔

بعض لوگوں نے **من وضوئہ** میں کلام کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مراد وہ پانی نہیں ہے کہ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعضاء مبارک کو مَس ہوا ہو بلکہ یہ وہ پانی ہے جو وضو سے بچ گیا تھا۔

اولاً تو ان کی یہ بات محل نظر ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے تو اس

بات پر غور فرمائیے کہ جو پانی وضو سے بچ گیا ہے اس کی اتنی برکتیں ہیں تو جو اعضاء مبارک کو چھو چکا ہوگا اس کی کتنی بے شمار برکتیں ہوں گی۔

قال اخبرنی محمود بن الربیع وھو الذی مج رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی وجھہ وھو غلام من بیرھم وقال عروۃ عن المسور وغیرہ یصدق کل واحد منھما صاحبہ واذا توضأ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کادوا یقتتلون علی وضوئہ

(بخاری شریف مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی ج ا ص ۳۱)

محمود بن ربیع جن کے بچپنے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کی قوم کے کنویں سے پانی لیکر (ازراہِ خوش طبعی و دِل لگی) ان کے چہرے پر کلی فرمائی تھی انہوں نے اور عروہ نے مسور وغیرہ سے روایت کیا ہے جبکہ یہ حضرات ایک دوسرے کی اس بات کی تصدیق کرتے تھے کہ جب نبی کریم ﷺ وضو فرماتے تو صحابہ کرام آپ ﷺ کے وضو کے پانی کے حاصل کرنے میں اتنی جدوجہد فرمایا کرتے تھے کہ معلوم یہ ہوا کرتا تھا کہ ابھی یہ حضرات آپس میں لڑ پڑیں گے۔

اس حدیث پاک سے یہ بات ثابت ہوئی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وضو مبارک کا پانی حاصل کرنا یہ ایک دو صحابیوں کے جوشِ عقیدت کی بناء پر ہی نہ تھا بلکہ ایسا کرنا صحابہ کرام میں رواج پا چکا تھا۔

اِس قسم کے بے شمار واقعات موجود ہیں جن کا اِنکار کوئی غبی نہیں بلکہ کجی رکھنے والا ہی کرے گا۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)